معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج ۔ اسٹریچن روڈ ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ـــــ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۰ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۹۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

وفیات

شذرات

انگریزوں کے دور میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ملک کی تاریخ مسخ کی جاتی رہی ہے جس کا سلسلہ قومی حکومت کے قیام کے بعد بھی جاری ہے۔ ہندوستان کو انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات تو مل گئی ہے لیکن ان کی ذہنی غلامی سے نہ ابھی تک چھٹکارا ملا ہے اور نہ ان کا پڑھایا ہوا نفرت و اختلاف کا سبق دل و دماغ سے محو ہوا ہے۔ یہ ملک کی بد قسمتی بھی ہے اور دور رس کی نا عاقبت اندیشی بھی، سیکولر جماعتوں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی اور کانگریس کی اکثریت کی تنگ نظری کا نتیجہ بھی ہے کہ اس وقت کئی ریاستوں میں ان لوگوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے جو ملک کو پراچین کال میں لے جانا چاہتے ہیں، انھیں نہ ملک کی تعمیر و ترقی سے دلچسپی ہے، نہ اس کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کی پروا ہے اور نہ عوام کے دکھ درد، بڑھتی ہوئی گرانی اور ملک میں ہر چہار سو پھیلی ہوئی بد عنوانی سے کوئی پریشانی ہے۔ ان کا مقصد ملک کی رنگا رنگ، گنگا جمنی تہذیب کو مٹانا، اس کا سیکولر کردار ختم کرنا، اور یہاں ایک خاص مذہب اور مخصوص قسم کی آئیڈیالوجی کا بول بالا کرنا ہے

چند ماہ پہلے مسلم حکمرانوں کے تعلق سے راجستھان کے امتحانی سوالات کا ذکر آیا تھا۔ اب ملک کی سب سے بڑی ریاست فرقہ پرستوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کی مہم عرصہ سے جاری ہے۔ مگر موجودہ ریاستی حکومت اس کو ہتھیانے کیلئے نت نئے ہتھکنڈے اختیار کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں عدالت، آئین اور ملک کے دستور کی کھلم کھلا توہین کرنے کے بعد بھی یہ اپنے کو سب سے بڑا محب وطن اور ملک کا وفادار کہہ رہی ہے۔ تاریخ کو مسخ کرنے کا مذموم عمل بھی اس نے شروع کر دیا ہے، اور بابر جیسے وطن دوست اور ہندوستان کو گل و گلزار بنانے والے بادشاہ کو فرقہ پرست، حملہ آور اور لٹیرا قرار دیا جا رہا ہے۔ اور یہ کہا جا رہا ہے کہ میر عبد الباقی نے مندر توڑ کر بابری مسجد بنائی تھی۔ جو افسانوں کو حقائق میں بدلنے اور جھوٹی سچی باتوں کو تاریخ کا جز بنانے کی مکروہ اور گھناؤنی سازش ہے۔ دار المصنفین نے ظہیر الدین بابر

اور بابری مسجد پر مستند اور محققانہ کتابیں شائع کی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند شخص کو ہندوستان سے بابر کی محبت و شیفتگی میں نہ شک و شبہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کا وہم و گمان کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی۔

تعصب اور فرقہ واریت کو فروغ دینے اور طلبہ کے خام اور کچے ذہنوں کو زہر آلود کرنے کے لیے اترپردیش حکومت تاریخ کی درسی کتابوں میں رد و بدل کر رہی ہے۔ وید اور رگ وید کی تصریح کے خلاف آریہ کو ہندوستان کا اصلی باشندہ بتایا جا رہا ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب کو ہڑپا تہذیب کا نام دیا جا رہا ہے۔ گیان بھارتی کتاب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سبق خارج کرنے، دسویں درجہ تک سنسکرت کو لازمی اور ویدک گرنٹ کو داخل نصاب کرنے کا حکم بھی جاری کیا گیا ہے۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ اب کسی نئے اقلیتی ادارے کو منظوری نہیں دی جائے گی، جو اقلیتوں کا قانونی اور دستوری حق ہے۔ وزیر تعلیم مسٹر راج ناتھ سنگھ نے تاریخ کی از سر نو تدوین کا مقصد "ہندوستانی کلچر" کو فروغ دینا بتایا ہے حالانکہ اس سے یہ ریاست دوسری ریاستوں کے تعلیمی دھارے سے الگ ہو جائے گی، ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی درہم برہم ہو جائیگی اور جنوبی ہند میں اس کے شدید رد عمل کا اندیشہ بھی ہے۔ خود اترپردیش کے سیکولر اور انصاف پسند لوگ ریاستی حکومت کی اس کارروائی کی شدید مذمت کر رہے ہیں۔

۸۲ء کے بعد اس سال ۳۰ اگست کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کا ایک جلسہ اس کے دفتر میں ہوا۔ اس میں یو۔ پی کے وزیر تعلیم نے اپنی حکومت کے بعض اقدامات کی تحسین کرتے ہوئے درسی کتابوں میں ترمیم و تنسیخ اور سنسکرت اور ویدک گرنٹ کو داخل نصاب کرنے کے منصوبے کا ذکر کیا۔ اس موقع پر بعض ارکان نے یاد دلایا کہ اکیڈمی اردو ہندی دونوں میں علمی کتابیں شائع کرتی تھی۔ مگر عرصہ سے

صرف ہندی میں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ہندی کے بعض پرجوش حامیوں نے اردو کو ہندی کی شیلی بتاتے ہوئے اس کا رسم الخط تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ راقم نے عرض کیا کہ اکیڈمی ہندوستان کی عام بول چال ہندوستانی کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی تھی خواہ وہ کسی رسم الخط میں ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی محققانہ کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" ہندوستانی اکیڈمی میں دیے گئے لکچروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں اردو رسم الخط میں یہاں سے شائع ہوئیں۔ رسم الخط بدلنے اور ہندوستانی اکیڈمی کے پلیٹ فارم سے غیر متعلق باتیں کہنا نامناسب ہے۔ چمن کے رنگ برنگ پھولوں سے اس کی زینت بڑھتی ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بعض دوسرے حضرات نے میرے خیالات کی مدلل تائید کی۔ بیٹھک میں اکیڈمی کے بعض عہدیداروں اور ادبی شعبہ کے چھ ممبروں کا انتخاب بھی ہوا۔

دارالمصنفین کو ایک ایسے انگریزی داں رفیق کی ضرورت ہے جو اسلامی علوم، تاریخ یا علمی موضوعات پر تحقیق کا تجربہ رکھتے ہوں۔ اس کے لیے یونیورسٹی کے وظیفہ یافتہ پروفیسر کی خدمات بھی ایک خاص مدت کے لیے قبول کی جاسکتی ہیں۔ قیام کا نظم یہیں کیا جائے گا۔ دارالمصنفین ان کی جو مالی خدمت کرسکتا ہے اس پر درخواست آنے کے بعد غور کیا جائے گا۔ تصحیح اور پروف ریڈنگ کے لیے عربی کے منتہی کی ضرورت ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی سے واقف شخص کو ترجیح دی جائے گی۔

مقالات

ایران شناس براؤن

از جناب ابوسعادت جلیلی صاحب

ایرانیات سے ایڈورڈ براؤن کو غیر معمولی شغف تھا، ایران کے تعلق سے انکے کارنامے نہایت گوناگوں ہیں اور اس حیثیت سے وہ متعدد امتیازات کے حامل تھے، مغربی دنیا میں ایرانیات کی طویل تاریخ میں براؤن سے قبل اور اب تک اس رتبہ اور پایہ کا کوئی شخص نہیں گزرا ہے گو متعدد مستشرقین نے ایرانی علوم و فنون، تمدن، تاریخ، مذاہب، ادبیات اور ان کے مختلف شعبوں کے ممتاز اشخاص کے کارناموں پر بحث و تحقیق کی ہے اور اس کہکشاں کے درخشندہ ستاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ بھی ہو رہا ہے مگر اس نظام سماوی کا مرکز اور جاذب نظر وہ آفتاب عالم تاب ہی ہے جس کا نام نامی ایڈورڈ براؤن ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ اس نے ایران پر جو بھی علمی کام کیا وہ خالصتہً علوم کی تحصیل و اشاعت کے نیک جذبات سے سرشار ہو کر کیا۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنی ہی مملکت برطانیہ جو اس وقت دنیا کی عظیم ترین اور وسیع و عریض سلطنت تھی کے مفاد کے خلاف ایران جیسے کمزور ملک کی سالمیت اور آزادی و خود مختاری کے لیے بے لوث سیاسی خدمات سرانجام دیں جس کی کوئی نظیر جدید دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تیسرے یہ کہ عام علماء ایرانیات کے برعکس براؤن

اپنے عظیم الشان کارناموں کے سبب صرف ایرانی فضلا میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی محبوب و مقبول تھے، علم و ادب اور سیاست کی دنیا میں ان کی قلمی اور عملی خدمات کی داستان آب زر سے لکھی جانے کے قابل ہے

حالات زندگی براؤن نے خود اپنی اولین تصنیف "سیاحت نامہ ایران" میں اپنے ابتدائی حالات لکھے ہیں۔ پھر ان کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب سے برطانوی و ایرانی اسکالروں نے جو "عجب نامہ" ترتیب دیا تھا اس میں بھی کسی قدر ان کے حالات منقول ہیں، ان کی رحلت کے بعد علامہ قزوینی نے "وفات نامۂ براؤن" میں ڈینین راس نے "دیباچہ سیاحت نامہ" میں، پروفیسر مجتبیٰ مینوی نے "روزگار نو" لندن کے مقالے میں اور پروفیسر عباس اقبال آشتیانی نے بھی ایک یادنامہ میں براؤن کی زندگی اور ایران کے تعلق سے ان کی خدمات پر اپنے تاثرات سپرد قلم کیے تھے براؤن کی زندگی اور علمی و سیاسی خدمات پر اب تک انگریزی، فارسی نیز اردو میں جو کچھ شایع ہو چکا ہے وہ کئی جلدوں کے بقدر ہے۔

ایڈورڈ گرینول براؤن گلوسسٹر شایر کے ایک گاؤں میں، ۷ فروری ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سر بنجامن براؤن وہاں کے بڑے انجینیر اور کشتی ساز تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد براؤن نے والد کے کہنے پر ڈاکٹری پڑھنے کے لیے طبی کالج میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں روس و ترکی کی جنگ نے براؤن کی توجہ بلکہ ہمدردی ترکی کی جانب منعطف کرا دی چنانچہ براؤن نے طب کے آخری درجوں کی تکمیل کے ساتھ ہی مشرقی السنہ کی بھی تحصیل شروع کر دی۔ اسی ضمن میں ایران پر مستشرقین کی کتب سے استفادہ کے دوران وہ ایران کی طرف ملتفت ہو گئے، کیمبرج یونیورسٹی میں

عربی اور ترکی و فارسی کی تعلیم کے بعد پمبروک کالج نے ایران کی ایک سالہ علمی سیاحت کی غرض سے براؤن کو فیلوشپ دی اور یہی ایران سے اس بزرگ ترین ایران شناس کے دائمی رشتۂ خاطر کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

ایران میں مسافرت و اقامت کا یہ ایک برس براؤن کے عظیم الشان عالمانہ و محققانہ کارنامہ کا گویا افتتاحیہ تھا۔ جس کے مشاہدات کو "سیاحت نامہ ایران" میں "ایرانیوں کے درمیان ایک سال" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے، اب تک انگریزی اور فارسی نیز اردو میں متعدد سفرنامے شایع ہو چکے ہیں لیکن غالباً علمی و معاشرتی حیثیت سے سرسید کے "مسافران لندن" کو چھوڑ کر کوئی سفرنامہ اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ ایران کے قیام اور مطالعے کا ہی یہ فیضان تھا کہ وہ پھر ایران اور ایرانیات کے ہی والہ و شیدا ہو کر رہ گئے اور انہیں ایرانی علوم اور مسایل پر کام کرنے کی دھن ہو گئی۔

براؤن کی ایران اور اہل ایران کے تئیں بے اندازہ محبت کے عملی مظاہر کا اندازہ ان کی علمی تحقیقات، سیاسی جد و جہد، فرقۂ بابیہ پر ان کی ہمہ گیر تحقیق، قلمی نوادر کی تلاش و پیشکش، تصانیف و نگارشات اور ان کی اپنی ذاتی خصوصیات غرض براؤن کی طویل زندگی سے بخوبی کیا جا سکتا ہے، ایران کی اسی سیاحت نے علما و عوام کے طبقوں میں ان کی مقبولیت کے بیج بو دیے تھے، اٹھارہ ۱۸ برس کی عمر کی سیاحت سے لے کر آئندہ چھیالیس ۴۶ سال کی خدمات کے بعد براؤن نے جب ۵ جنوری ۱۹۲۶ء کو آخری سانس لی تو پورے ایران میں صف ماتم بچھ گئی۔ صرف چار برس پہلے براؤن کے معاصر آرنلڈ اور شاگرد نکلسن نے ان کے اعزاز میں "عجب نامہ" مرتب

کیا تو ساٹھویں سالگرہ کی مناسبت سے ہی ایرانی زعماء و افاضل نے مل کر ایک خصوصی نامۂ سپاس براؤن کی نذر کیا اور ملک الشعراء میرزا محمد تقی بہار سمیت سولہ بڑے بڑے شعراء نے براؤن کی تحسین میں قصائد تحریر کیے تھے۔

برصغیر میں براؤن کے سب سے بڑے مداح و معترف حضرت مہدی افادی کی رحلت ہو چکی تھی لیکن دوسرے سب شیدائی موجود ہی تھے جن میں اقبال، سید سلیمان ندوی، بابائے اردو اور پروفیسر شیرانی کے علاوہ براؤن کے شاگردان رشید و عزیز مولوی محمد شفیع، پروفیسر شیخ محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد نظام الدین جیسے ارباب فضل و کمال شامل تھے۔ اقبال نے یہ یادگار تاریخی قطعہ موزوں کیا:

نازش اہلِ کمال ای جی براؤن	فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ او سینہ چاک	از فراقِ او دلِ مشرق دو نیم
تا بفردوسِ بریں ماوا گرفت	گفت ہاتف ذالک الفوز العظیم (۱۹۲۶)

علامہ سید سلیمان ندوی نے "معارف" جنوری ۱۹۲۶ء کے تعزیتی اداریے میں اس کو سب سے بڑا سانحہ قرار دیا اور لکھا "علمی دنیا میں نئے سال کا سب سے افسوسناک سانحہ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کی وفات کا ہے"۔ مولوی عبدالحق نے فی الفور اختر شیرانی سے علامہ محمد خان قزوینی کا یادنامہ براؤن ترجمہ کروا کے "اردو" میں طبع کروایا اور بعد میں چند اسکالروں سے "تاریخ ادبیات ایران" کی مجلدات بھی اردو میں منتقل کرائی جن کی پہلی جلد میں اردو اور انجمن ترقی اردو کے تئیں براؤن کے ہمدردانہ رویے اور تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ براؤن کی رحلت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مجلہ "جامعہ" نے سلسلہ وار مقالہ پیش کیا۔

ایران اور اہل ایران سے براؤن کی محبت

براؤن کو ملک ایران سے جو بے انتہا محبت تھی اس کا بیّن ثبوت ان کی مستقل تصانیف اور متعدد نگارشات ہیں۔ اس کا اعتراف ایران کے اربابِ کمال ہی کو نہیں برصغیر کے بھی متعدد اصحاب علم و ادب کو بھی تھا۔ مثلاً مہدی افادی، محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، اختر شیرانی، شیخ عطاء اللہ، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر، ڈاکٹر صدیق جاوید۔ ایران کے بارے میں ان کے قلبی محسوسات سے حظ اندوزی کے لیے ان کی نگارشات و تصنیفات کا مطالعہ ضروری ہے، ان میں ایران سے ان کے تعلق خاطر کے بے مثال و بے نظیر نمونے ملتے ہیں۔ جیسے براؤن کی علمی و ادبی خدمات، تحقیق و تصحیح متون، بابی تحریک سے متعلق عملی سرگرمیاں اور ایران کے حق میں بیباکی ہوئی سیاسی مہم وغیرہ ہے۔

اہل ایران کے سیاسی یعنی ملکی و قومی حقوق کی تائید و حمایت کا براؤن کا طویل عمل ایران کے داخلی و خارجی حالات کی رعایت سے دوگانہ تھا، ایران میں قاچاریوں کے اخیر زمانے میں مشروطہ یعنے جمہوریت کے قیام کے لیے بڑی زبردست جدوجہد ہو رہی تھی۔ حال میں ایک فاضل برطانوی خاتون پروفیسر نے بھی اپنی تحقیق موسومہ THE QAJAR IRAN میں اس دور کی رستخیز پر روشنی ڈالی ہے۔ آخری قاچار بادشاہوں کے روز بروز افزوں ظلم و جبر کے خلاف ایرانی عوام جب اٹھ کھڑے ہوئے تو براؤن ان مستبد حکمرانوں کا تختہ الٹنے کی داعی تحریکوں کے مؤید تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے پس پشت عوام کی قوت تھی جو کئی نسلوں سے مسلسل کشاکش میں جکڑے ہوئے تھے۔ بالآخر یہ طاقتور تحریکیں رنگ لا کر رہیں اور انھوں نے

قاچار حکومت کے پرخچے اڑا دیے۔ براؤن کا ایرانیوں کی کھلی طرفداری اختیار کرنے کا عمل روسی و برطانوی تسلط کے خلاف بڑا ہی موثر اور اہم تر تھا جو ان کی جانب سے انتہائی بے غرضانہ اور خالصتہً احقاق حق کی خاطر تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

براؤن کا اہم علمی و ادبی کارنامہ

"عہد عثمانی کی شاعری کی تاریخ"۔ HISTORY OF OTTOM
AN POETRY-اور طب عربی"۔ ARABIC MEDI
CINE۔کوترکی ادبیات اور عربی میں تحقیق پر براؤن کی عالمانہ دستگاہ کا بڑا مظہر مانا گیا ہے جب کہ ایرانی ادبی ارتقاء پر ان کی تاریخی مجلدات ان کی امہاتِ کتب تسلیم کی جاتی ہیں۔ براؤن نے اپنی پوری عمر ایرانیات کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس طرح ان کی زندگی ایران کے تمدن اور ادب کے موثرات کی تدقیق و تہذیب اور اشاعت کے کاموں کے لیے مختص رہی۔ اس باب میں ان کی تصانیف کیساتھ کئی تالیفات کے نام بھی آتے ہیں جن میں "تاریخ ادبیات ایران" کی جلدیں سب سے بالاتر ہیں۔

براؤن کا یہ محققانہ کارنامہ موسومہ LITERARY HISTORY OF PERSIA ۱۹۰۲ سے ۱۹۲۴ تک صفحہ قرطاس پر منتقل ہوتا رہا جس کو اربابِ فن نے تحقیقی ادبی اور لغوی نیز اسلوب کے اعتبار سے شہ پارہ قرار دیا۔ براؤن خود بھی اس کو اپنا حاصلِ زندگی خیال فرماتے تھے۔ ان کی رحلت پر ان کے دست راست اور جید ایرانی اسکالر علامہ قزوینی نے شاید ارتجالاً یا ذہنی طور پر جو حکم لگایا تھا وہ ان کے محض ذوق سلیم کا ہی آئینہ دار نہیں تھا بلکہ آج کامل ۶۵ برس گزرنے کے بعد بھی قزوینی کا تاثر وجدانی نوعیت کا

قرار دیا اور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"تاریخ ادبیات ایران" سی وسیع الذیل تحقیق کسی مغربی یا ایرانی استاد یا مورخ ادب کے قلم سے اس وقت تک سامنے نہیں آئی تھی"۔

ہمارے یہاں براؤن کے ایک خورد معاصر ریوبن لیوی کی مختصر ترین "پرشین لٹریچر این انٹروڈکشن" نیز ایرانی اسکالر رضازادہ شفق کی تاریخ ادبیات عشاق کی کمی نہیں گو وہ فقط "برائے دبیرستان ہا" یعنے مدارس کے لیے رہا ہے اس کے بعد ملک الشعرا میرزا محمد تقی بہار کی اسلوبی تحقیق کی تین جلدیں بعنوان "سبک شناسی" "تاریخ تطور نثر فارسی" سے لے کر استاد جلال ہمائی کی "تاریخ ادبیات در ایران" اور ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی بھی اسی نام کی تاریخ کی سہ گانہ مجلدات تک کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آربری کی "کلاسیکل پرشین لٹریچر" کو بڑی حد تک تواریخ براؤن کی توسیع بلکہ تکملہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم ان سب اور دوسرے کئی کاموں کے باوجود قزوینی آج ہوتے تو اپنے اسی قول کے اعادے پر اکتفا کرتے۔ خدانخواستہ ان ادبی تواریخ کی قدر و قیمت سے کسی طور انکار مقصود نہیں ہے بلکہ براؤن کی مجلدات کی تاسیسی PIONEERING حیثیت و نوعیت کے بارے میں عرض کرنا مطلوب ہے۔

قلمی نوادر کی تلاش و پیشکش

براؤن کے بزرگ معاصر گِب نے جو ترکی پر تحقیقات کی بنا پر خاورشناس بزرگوں میں ممتاز تھے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے ترکے سے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو مشرقیات پر اہم مطبوعات کا سلسلہ شروع کرے چنانچہ "گب میموریل" کے نگران اعلیٰ براؤن ہی مقرر ہوئے اور آخر تک وہی یہ

فریضہ انجام دیتے رہے۔ براون نے قزوینی کے ذوق تحقیق اور علم و فضل کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے ادب فارسی کے نوادر کی تفہیم کا خاصا کام لیا اور کئی مخطوطات کی جو پردۂ گمنامی میں صدیوں مستور تھے اسی ادارے کی وساطت سے اشاعت کا اہتمام کروایا۔ براون کو نادر علمی و ادبی متون کی دریافت و جمع آوری کا ہی شدید خیال نہیں رہتا تھا بلکہ ان کی صحت اور ایڈیٹنگ کے لیے خود بھی عرق ریزی کے ساتھ مصروف رہا کرتے تھے۔ اس جانب بھی قزوینی نے خاص طور سے اشارہ کیا ہے کہ وہ اس تعلق سے اپنا ذاتی صرفہ کرنے میں بھی ہمیشہ پورے شوق سے مستعد رہتے تھے۔

بے محل نہ ہوگا اگر اس بارۂ خاص میں ایک واقعہ پیش کیا جائے جو حکیم ناصر خسرو کی "وجہ دین" نامی تصنیف کی بازیافت سے متعلق ہے۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی راوی ہیں کہ "اس امر کی اطلاع ہونے پر کہ یہ کتاب پیٹروگریڈ میں موجود ہے، بعض مشرقی فضلاء کو جو ناصر خسرو پر ریسرچ کر رہے تھے شوق پیدا ہوا کہ جس طرح بھی بنے اس کتاب کی نقل حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر براون نے مالی مدد دی اور آقا سید حسن تقی زادہ نے پیٹروگریڈ جا کر اس مکمل کتاب کا فوٹو لیا اور برلن میں لا کر آقائے مرزا محمد خاں قزوینی کی امداد سے اس کو بڑی قابلیت کے ساتھ ایڈٹ کیا اور بعد ازاں اسے مطبع کاویانی برلن نے عمدہ کاغذ پر نفیس ٹائپ میں چھاپا۔ کتاب کے صفحات ۳۵۴ ہیں اور وہ ربیع الاول ۱۳۴۳ ہجری مطابق اکتوبر ۱۹۲۴ میں شایع ہوئی ہے" (حکیم ناصر خسرو بلخی "در صحیفہ" ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ "ادبیات فارسی نمبر" ص۸۶) اسی طرح اپنی ذاتی ضروریات کے مطابق علمی تحقیقات کے لیے مطلوبہ نسخوں کی اصل یا نقل کے حصول کی خاطر براون

بے دریغ خرچ کیا کرتے تھے، اسی طرح دوسرے تحقیقی کاموں اور احباب کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی وہ بہت کچھ خرچ کرتے تھے۔

بابی فرقے یا تحریک پر عملی تحقیق

جس زمانے میں ایران کی تحریک مشروطیت قاچاری استبداد کے خلاف زور پکڑتی جا رہی تھی اور حکومت عوام پر نت نئے ظلم و ستم ڈھانے پر پوری طرح تلی ہوئی تھی، علی محمد باب شیرازی نے ایک نئے عنوان سے ایرانی معاشرے میں حرکت بپا کرنا شروع کیا۔ یہ ایک نیم سیاسی نیم مذہبی تحریک تھی جس کا مقصود ایران میں جمہوری طرز حکمرانی یعنی مشروطہ یا پارلیمانی نظام کا قیام و استحکام اور قاچاری حکومت کا خاتمہ تھا۔ براون نے جب فرانسیسی خاورشناس کاونٹ دوگوبینو کی متعلقہ کتابیں ملاحظہ کیں تو انہیں بابی مذہب یا تحریک کی حقیقت و اصلیت پر تحقیق کو عملی انداز میں توسیع دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس راہ میں کئی دشواریاں حائل تھیں کہ اہل فرقہ کا رازدارانہ طرز زندگی اور تبلیغ و اشاعت کا خفیہ انداز اس کے امور و معاملات کو بے حد پُراسرار بنا چکا تھا۔ عوام در کنار خواص بھی تحریک کے قائدین کجا مبلغوں اور کارکنوں تک کی مصروفیات سے لاعلم تھے کیونکہ صرف حلفیہ طور پر اس فرقے کی رفاقت اختیار کرنے والے لوگ ہی اس کے معاملات و کوائف سے واقفیت حاصل کر سکتے تھے۔ تاہم براون نے بابی تحریک کے حقائق جاننے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

A TREATISE ON BABI RELIGION کے مقدمے میں براون نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اس راہ میں انھوں نے کتنی مشکلیں برداشت کیں اور کیسے دشوار گزار مراحل طے کر کے بابیوں کی اصل حقیقت دریافت اور منکشف کی۔ ابتداءً

براؤن نے اپنے یک سالہ سفر ایران کے موقع پر باب کے پیروکاروں سے ربط وتعلق پیدا کیا اور ان سے معلومات کے حصول کے بعد وہ بیرون ایران واقع تحریکی مرکز عکا بھی گئے جو فلسطین میں ہے۔ یہ شہر اس وقت بابی مذہب کا اپنا صدر مقام بلکہ سرچشمہ بنا ہوا تھا جہاں بہاء اللہ مرزا حسین علی اور مرزا یحییٰ مقیم تھے۔ ان مرکزی لیڈروں سے ملاقاتوں اور تبادلۂ خیالات کے بعد براؤن بابی تحریک کے دوسرے اہم شہروں اور ملکوں ترکی اور مصر و شام کے تحقیقاتی دورے پر گئے اور وہاں کے بھی قائدین سے رابطہ قائم کیا۔ انہی سیاحتوں کے دوران براؤن نے مذہب بابیہ کی اصل اور پوشیدہ دستاویزات حاصل کر کے ملاحظہ کیں اور ان کے خفیہ لٹریچر کے بھی اجزا جمع کیے۔

اس طرح براؤن نے موثق اور معتبر و مستند اطلاعات کی مدد سے اور ان کی بنیاد پر مذکورہ کتاب تصنیف کی۔ فرانسیسی کے کمتر دائرہ اثر اور براؤن کی وسیع علمی جستجو سے ہونے والے بیشتر اضافوں کی بنا پر بھی کاونٹ دوگوبینو سمیت گزشتہ محققین کی کتب پر براؤن کی تحقیقات کو فوقیت حاصل ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ تصنیف درجۂ استناد کی مالک ہے تو علمی تحقیق و تدقیق اور براؤن کے عملی شدائد کی رو سے اپنے موضوع پر رتبۂ اعتبار کی حامل ہے۔ بابی مذہب بہائی مسلک کی اصل اور ثانی الذکر اپنے نظام عقاید و اعمال کی رو سے اس کی فکری توسیع کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے بہائیت کے اپنے مقاصد و مزعومات کی تفہیم فرقۂ بابیہ پر براؤن کے محققانہ کارنامے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف اردو فکشن کی مقبول شخصیت ام سلمیٰ قرۃ العین طاہرہ زرین تاج کے تصور جلال و جمال سے وابستہ

تمام تر حسین و جمیل تخیلات کا سرچشمہ اس کی شعریات ہے تو اس کی زندگی کے مطالعے کا وسیلہ براؤن کی تحقیقی جستجو سے استفادہ۔

ایران کی آزادی کے تئیں براؤن کی خدمات

روس اور خود برطانیہ کی استعماری حکمت عملی کے خلاف براؤن کا برملا اظہار اس کی اپنی زندگی ہی کا نہیں بلکہ جدید تاریخ اور موجودہ صدی کی سیاسی تاریخ کا بھی ایک زریں باب ہے۔ اس نے ایران کے قومی سرمایے یعنی تیل کے کارخانوں پر برطانیہ کے قبضے کے خلاف بلا رو رعایت سخت اور زبردست احتجاج کیا۔ انھوں نے کھلم کھلا برطانیہ اور زاری روس کی بھی ایران پر دباؤ کی دو طرفہ پالیسیوں کی شدید مخالفت کی۔ ایک غیر ملک اور کمزور و پسماندہ قوم کے حقوق کی خاطر اپنی ہی مملکت کے اقدامات کے خلاف اصولی اور صحیح موقف اختیار کر کے کھلے عام اسے ظاہر کرنا براؤن کی بہت بڑی جسارت اور ایرانیوں کے تئیں ان کی محبت و شفقت کی انتہا تھی۔ براؤن نے اپنے بیانات اور مقالات کے ذریعے برطانیہ کے سیاسی ایوانوں کے اراکین پر ہی اثر انداز ہونے کی کوششیں نہیں کیں بلکہ وزراء سے ملاقاتیں کر کے حکومتی پالیسیوں کو نشانۂ تنقید بنایا اور ایران کے خلاف سرکاری رویوں میں مثبت تبدیلی پر زور دیا۔ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے اور ایران کی پشت پناہی کے لیے اپنے ملک میں عام فضا تیار کرنے کے لیے براؤن نے کانفرنسیں تک منعقد کیں۔

براؤن کی اس جدوجہد اور ایران کے تئیں بے لوث دوستی کے برعکس دوسرے خاورشناس بزرگوں کی ذہنی حالت کیا تھی اس کو سمجھنے کے لیے صرف ایک واقعے کی طرف اشارہ ہی کافی ہوگا۔ ڈاکٹر محمد باقر براؤن کی رحلت کے بارے

برس بعد لندن گئے اور اس کے شاگرد ہوئے۔ ان دنوں ایران میں برطانیہ و روس کے مشترکہ مفاد کے خلاف جرمن سفارت کا اثر و رسوخ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور ہٹلر کی قیادت میں جرمنی برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے لیے یورپ میں بھی بہت بڑا خطرہ بن چکا تھا۔ اس زمانہ کا ایک تاثر یہاں نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر باقر کی روایت ہے کہ

"سرڈینیسن راس مشرق وسطیٰ کے لیے برطانوی حکومت کو کانوں اور آنکھوں کا کام دے رہے تھے اور ایران اور فارسی سے دلی لگاؤ ہونے کے باوجود ان کے آپ کے دل میں ایرانیوں کے خلاف ایک قسم کی کدورت سی پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے کہا "مجھے یہ خدشہ ہے کہ ایران میں بھی ہماری ساکھ بگڑ رہی ہے"۔ میں نے کہا: "ایران کے سیاسی تعلقات بگڑنے کی صورت میں انگریزی سرمایہ کو اینگلو ایرانین آئل کمپنی چھن جانے سے بہت نقصان ہوگا"۔

سرڈینیسن راس ایک لحظہ خاموش رہے، ایک لمحہ کے لیے ان کے چہرے پر بے بسی کے آثار ہویدا ہوئے اور پھر یکایک ان کی آنکھوں کی چمک واپس آگئی، انکے ابھرے ہوئے رخساروں میں خون جلدی جلدی گردش کرنے لگا اور میز پر ہاتھ مار کر کہنے لگے، "ایں جنگ جنگی است کہ باید یک طرف بکلی از میان برود" اور چند سال بعد جب میں نے سنا کہ رضا شاہ تخت چھوڑ کر برازیل جا رہے ہیں تو مجھے سرڈینیسن راس کے الفاظ پھر یاد آئے" ("سرڈینیس راس، میرے استاد" در "مخزن" مارچ ۱۹۴۹ء صفحہ ۲۰) ایران کے تئیں براؤن نہ صرف تعصب اور ذہنی ادبار کے حامل رویوں سے ایک دم محفوظ و مبرا تھے بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ ایران کی

مخالفانہ برطانوی پالیسیوں کے بھی بہت بڑے نقاد تھے اور احقاق حق کی خاطر کمال بے لوثی سے اپنے ملک میں ایران کے حامی و ناصر بنے رہے۔

براؤن کی عظمت اور خصوصیات اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے براؤن کی سیرت و کردار کی بلندی پوری طرح عیاں ہے دراصل عصبیت میں ملوث ہونا تو درکنار ایران کے حقوق کی خاطر انھوں نے خاص ملکی مفادات تک کو پس پشت ڈال کر اپنے افراد قوم کو بھی ایران کی حمایت پر آمادۂ عمل کرنے کے لیے ۱۹۰۶ سے ۱۹۱۴ تک سرگرمی سے کام کر کے دکھایا۔ ان کی شخصیت کی دوسری خصوصیتوں میں علمی ادبی صفات اور خصائل حمیدہ بھی شامل ہیں۔ ان سب کا تقابل دوسرے خاورشناس فضلا اور براؤن کے اپنے امتیازات کی جستجو میں کیا جا سکتا ہے اور مجرد براؤن کی اپنی تحقیقی و تصنیفی خصوصیات کے تعین کے نقطۂ نظر سے بھی ممکن ہے۔ ابتدا ہی میں اس جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ براؤن کے شخصی اور ادبی کردار میں ایسی خصوصیتیں ہیں جو انہیں علمائے ایران اور مستشرقین کی صف میں ارجمند مقام عطا کرتی ہیں۔ براؤن کی مشاہدات پر مبنی سوانحیات میں ہی نہیں ان کے بعد کی مطالعاتی تحریروں میں بھی انکے ایسے امتیازی اوصاف پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

براؤن کے ادبی خصائص میں سے ایک فارسی اشعار کی معنی خیز ترجمانی پر ان کی قدرت بھی تھی، چنانچہ ان کی متعدد تصانیف اور نگارشات سے ان کا یہ کمال فن عیاں ہے کہ وہ انہیں بخوبی انگریزی شعر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے جس سے ان کے ذوق سلیم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ افق مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت اور بکثرت ملاقاتوں کے بھی سبب سے اس ہفت زبان اسکالر کو لاتعداد حکایات، کہاوتیں اور

ضرب الامثال تو ذہن نشین تھیں جن کو اپنی گفتگو و نگارش میں وہ بلا تکلف اور بے اختیار
نقل کرتے تھے، عربی و ترکی اور فارسی نیز یورپی زبانوں کی بھی ضرب المثلوں اور
کہاوتوں بلکہ کہانیوں کو بھی وہ استعمال کیا کرتے چنانچہ ان کی کتابوں اور دوسری تحریروں
میں مختلف زبانوں کی خاصی تعداد میں یہ حکایتیں یا چھوٹی داستانیں نیز کہاوتیں اور
ضرب الامثال شفق کے مانند پھولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

دیگر خاورشناسوں اور ماہرین ایرانیات اور براون میں ایک مابہ الامتیاز
فرق یہ تھا کہ براون کا ذہن و قلم نہ ایران کے تئیں کسی نوع کی مصلحت اندیشی کا شکار
ہوا اور نہ ہی کم نگاہی اور کوتاہ بینی کا نشانہ بنا۔ ایران کی اندرونی رستخیز اور
تاجداری بادشاہوں کے خلاف احیائے جمہوریت کی عوامی تحریکوں کے دوران براون
نے ملکی یا قومی مصالح سے قطع نظر ان کی پشت پناہی کا رویہ اختیار کیا اور دو مبسوط
جائزوں میں اس پوری جد و جہد کو محفوظ کر گئے۔ ان یادگار مطبوعات میں سے
انھوں نے "انقلاب ایران" PERSIAN REVOLUITION نامی کتاب
۱۹۱۰ء میں تصنیف فرمائی جو قریب ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ایک ذہنی اور تحریکی تاریخ ہے
جس سے تحریک مشروطیت کا کوئی محقق و مورخ بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ "ایران
جدید کی صحافت اور شاعری" (PRESS & POETRY OF MODERN IRAN)
بھی مشروط یا پارلیمانی جمہوری نظام کے تصور کو عامۃ الناس کے حلقوں میں تقویت
اور حرکت بخشنے والی کتاب ہے۔

دنیائے علم و دانش کے اس یگانۂ روزگار کو بھی ناقدری کا سامنا کرنا پڑا
براون کی بابی تحقیقات پر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور انہی کی روایت سے راس کا بھی تبصرہ
ان الفاظ میں ہم تک پہنچا ہے۔

"سر ڈینیسن راس اپنے معاصرین کے کام کے بعض پہلوؤں کے متعلق اپنی مخصوص رائے
رکھتے تھے جس کا یہاں ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مثلاً ایک دن مجھ سے
کہنے لگے کہ "پروفیسر براون نے بابیوں پر اپنی عمر عزیز کے چودہ سال ضائع
کیے، حالانکہ وہ تحریک اتنی اہم نہ تھی کہ اس پر اتنا وقت صرف کیا جاتا"؛
اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود ایران میں یہ تحریک اب قریباً معدوم ہو چکی ہے اور
ایرانی زندگی پر اس نے کوئی پائدار اثر نہیں چھوڑا تو اس سے سر راس کی رائے میں
خاصا وزن نظر آتا ہے" ("برطانوی مستشرقین کی خدمات در بارۂ ایران و
ادبیات ایران" در "صحیفہ" اکتوبر ۱۹۷۱ء ص ۱۲۴)۔

ڈاکٹر محمد داؤد رہبر اپنے والد اور براؤن کے ایک عزیز و ارشد طالب علم ڈاکٹر
شیخ محمد اقبال کے حالات کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"وہ ۱۹۱۸ء میں انگلستان روانہ ہوئے تو وہاں عربی کی ریسرچ کے لیے لیکن پروفیسر
براون جو ان کے نگراں تھے فارسی سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، انھوں نے فارسی میں کام
کرنے کی رائے دی۔ براون کے ساتھ ان کو چار سال قریبی تعلق رہا، تقریباً روزانہ
ملاقات ہوتی تھی۔ براون کے متعلق دلچسپ باتیں سناتے تھے۔ ایک تو یہ کہ براون کے
فکر کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ زبان یارا نہ کرتی تھی، چنانچہ اکثر فقروں کو ادھورا
چھوڑ جاتے تھے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ میں اکثر براون کا کتب خانہ دیکھا کرتا۔ اس میں جتنی
کتابیں کھول کر دیکھنا شروع کرے اوراق پر نشانیاں اور یادداشتیں ہوتیں باقی کتاب
صاف، بس وہ شروع ہی کے صفحے پڑھا کرتے اور اسی سے کتاب کی مجموعی قدر پر حکم
لگا دیتے۔ جن لوگوں نے انکی تاریخ ادب پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ہر ادبی تصنیف کی

فہرست مضامین بیان کرنے پر قناعت کرتے ہیں یا مثلاً ایسی باتیں بیان کرتے ہیں کہ اس
کتاب میں ممدوحین کی تعداد کیا ہے وغیرہ۔ ادبی تنقید بہت کم کرتے ہیں۔"

("اباجی" در "ادبی دنیا" ۱۹۴۹ء) یہ واضح نہیں ہے کہ آخر الذکر تاثر اضافہ ہے یا پروفیسر
اقبال کی رائے کا ہی حصہ ہے۔

تاریخ ادبیات ایران
مہدی افادی کی نظر میں

مہدی افادی نے کچھ تحفظات کے ساتھ براؤن کی تاریخ ادبیات کا ذکر تحسین کے ساتھ بار بار کیا ہے، خصوصاً وجدان و ذوق کے معاملات کے معاملے میں وہ شبلی کے اور علمی تحقیق کے پائے کے اعتبار سے براؤن کے قائل تھے۔ شبلی پر ایک مفصل اظہار خیال کے دوران ادب ایران کی تاریخی مجلدات کا تذکرہ ان کے لیے ناگزیر ہو گیا۔

"میری غرض پروفیسر براؤن کی فارسی سے ہے جو اس قوم کی زندہ یادگار ہے جو بلحاظ
گزشتہ عظمت و ترقیات دنیا کی متمدن اقوام میں خاص تاریخی وقعت رکھتی ہے۔ انگلستان
مستشرقانہ مشاغل کے لحاظ سے یورپ کے اور ممالک سے بہت پیچھے ہے تاہم وہاں ایک
جماعت موجود ہے جو السنۂ مشرقی میں اہل زبان کی سی مہارت رکھتی ہے۔ حال میں
پروفیسر براؤن نے ادبی حیثیت سے "تاریخ العجم" لکھی ہے جس کی دو مبسوط اور ضخیم
جلدیں اس وقت تک شایع ہو چکی ہیں۔"

("آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ" در "البشیر" ۱۹۰۶ء منقولہ "افادات مہدی" معارف پریس
اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء صفحہ ۹۶/۹۹)

"تاریخ ادبیات ایران" جلد اول پر حضرت مہدی کا یہ مبصرانہ تاثر بے حد قابل استفادہ
ہے، "دور اخمانیاں (ہخامنشی) یعنی فارسئ قدیم کے ساتھ اس نے ساسانیوں کے عہد
کے لٹریچر یعنی زبان پہلوی کا پورا مرقع کھینچا ہے جو تمام و کمال گویا زرتشتی لٹریچر ہے۔ اس نے

نہایت قدیم کتبوں اور تاریخی اسناد سے اس عہد کی علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں جن کی
یادگار پارسیوں کا صحیفۂ غیبی یعنی "اوستا" ہے جس کی تفسیر پہلوی اور شرح الشرح
"زند یا زند" ہیں۔ مجوسیوں کی ایام جاہلیت کی تاریخ کے بعد جو نہایت عسیر الحصول
ماخذوں سے مرتب کی گئی ہے تیسرے دور میں فاتحین اسلام کے تصرفات یعنی عربی کی
آمیزش نے زبان پر جو اثر ڈالا ہے ان جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ارتقائی حیثیت
سے یہ دکھایا ہے کہ فارسی جدید کس طرح عالم وجود میں آئی۔ اسی طرح مسلمانوں کی مفصل
دماغی تاریخ لکھی ہے اور اس کو متعدد دور میں تقسیم کیا ہے۔ جدت یہ ہے کہ ساتھ
ہی ساتھ عجمی عنصر کو الگ کر کے دکھاتا گیا ہے۔"

مہدی افادی نے اور بھی مواقع پر براؤن کے سلسلۂ تاریخ کو صحیح معنوں میں ایرانی ملت کی ذہنی و فکری تاریخ گری قرار دیا ہے گویا عام ادبی تاریخوں سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع۔
ادبی تاریخ کی جلد دوم بھی حضرت مہدی کی نگاہِ تنقید میں ایک وقیع کاوش ہے۔

"پہلی مقدمہ کی حیثیت سے ہے۔ دوسری میں جو ابھی شایع ہوئی ہے فردوسی سے
لے کر سعدی کے وقت کی لٹریری سرگزشت ہے جس میں مختلف عہد کے لٹریچر کے
ساتھ لگے لپٹے واقعات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جو کسی حیثیت سے تاریخی وقعت رکھتے
ہیں۔ پھیلاؤ غضب کا ہے، لکھنے والا سب کچھ سمیٹتا گیا ہے۔ لٹریچر کی تاریخ تو اس
سے پہلے بھی لکھی گئی ہے لیکن مسلمانوں کی دماغی تاریخ پر قلم اٹھانا ان اصلی ماخذوں
کی چھان بین کے بعد جو یورپ کی عظیم الشان لائبریریوں میں لائق حصول ہیں
پروفیسر براؤن کا حصہ تھا۔ یہ نمونہ جس کی نظیر انگریزی کے سوا مغربی
لٹریچر میں بھی موجود نہیں ہے اپنی ندرت اور دلچسپی کے لحاظ سے ہر طرح

پیروی کے لائق ہے"۔

ہدی افادی حقیقی معنوں میں براؤن اور شبلی کو ایک دوسرے کا ہمسر، مثیل اور بہترین نعم البدل خیال فرماتے تھے جو ان کے ادبی اخلاص اور علمی ذوق کی انتہا تھی۔ چنانچہ وہ سوال کرتے ہیں کہ "لیکن شبلی کے سوا آج ملک میں اسلامی لٹریچر کے متعلق کون اس قسم کے وسیع لٹریری تحقیقات کا ساتھ دے سکتا ہے؟"

اس کا جواب علامہ شبلی نے "شعر العجم" کی صورت میں پہلے ہی دے دیا تھا، جب کہ نثری ادب کے خاص حوالے سے ملک الشعرا بہار نے "سبک شناسی" کے عنوان سے تین جلدوں میں دیا۔ تاہم یہ امر واضح ہے کہ دونوں کارناموں کا احاطہ ایک ایک صنف کو محدود ہے جب کہ ایران میں پروفیسر جلال ہمائی و ذبیح اللہ صفا صاحبان نے مطلوبہ اور پوری پوری جامعیت کے ساتھ اپنی اپنی تواریخ ادب کی مجلدات پیروئی براؤن میں ہی پیش کیں۔ چنانچہ اس توسیعی عمل کو ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے براؤن کے واضح و ہمہ گیر اثرات میں سے قرار دیا ہے۔

"ایرانی ادبیات پر ایسی جامع و مانع تالیف نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی تھی اور نہ اس کے بعد معرض تحریر میں آئی ہے۔ بعد کے آنے والے مولفین نے نہ صرف اس سے مفید مطلب معلومات حاصل کیں ہیں بلکہ اپنی تالیف و تصنیف کے سلسلے میں اسے بطور نمونہ اختیار کیا ہے۔ خود ایرانی ادیبوں نے عہد حاضر میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں پروفیسر براؤن کے انداز تالیف اور طرز تصنیف کا اثر نمایاں ہے" (صحیفہ" اکتوبر ۱۹۸۱ ص ۱۲۶)

صوفیائے بیجاپور کے دو اہم فارسی تذکرے

از جناب عارف نوشاہی صاحب

یہاں صوفیائے بیجاپور کے زیر بحث تذکروں کا کوئی تفصیلی و تحقیقی جائزہ پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے مطالعہ سے حاصل ہونے والی دو اہم معلومات قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں:

اول یہ کہ گیارھویں صدی ہجری میں جنوبی ہند کے صوفیا کی مکالماتی زبان اردو تھی۔

دوسرے فارسی کی معروف انشائے نور اللہ کے مصنف کا تعین کرنا ہے۔

یہ دونوں تذکرے خوارقات الحیدریہ اور منتخبات روضۃ الاولیا، ایک ہی جلد میں مجلد ہیں اور ان کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۲۷ جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ ہمارے عزیز دوست صاحبزادہ نعیم اختر قمر مجددی ساکن سر میدانی ضلع شیخوپورہ (صوبہ پنجاب، پاکستان) نے ہمیں ۱۹۸۶ء میں دکھایا تھا۔ معلوم نہیں اب یہ نسخہ انہی کے پاس ہے یا کسی کتبخانے میں محفوظ کرا دیا ہے[1]۔

خوارقات الحیدریہ اس کے مصنف ابراہیم خوند ہمای نے یہ کتاب قلعہ اودنی میں ۷ ذی الحجہ ۱۰۸۱ھ / اپریل ۱۶۷۱ء کو لکھنا شروع کی اور بوقت عصر ۱۱ ربیع الاول ۱۰۹۰ھ / اپریل ۱۶۷۹ء کو پایۂ تکمیل تک پہنچائی[2]۔ مصنف نے پہلے یہ کتاب شاہ درویش قادری نبیرۂ میران شاہ حیدر ولی قادری کی فرمائش پر نظم میں لکھی تھی بعد میں

انہی کے کہنے پر اسے نثر میں منتقل کیا۔ ہمارے پیش نظر اس کا منثور متن ہے۔

خوارقات الحیدریہ بیجاپور کے بعض قادری مشایخ کا تذکرہ ہے[۱۴]۔ اس میں چالیس[۴۰] خوارق درج ہوئے ہیں۔ خارقہ یکم تا چہاردہم[۱۴] حضرت میراں شاہ حیدر ولی قادری کی کرامات کا تذکرہ ہے۔ حضرت موصوف سید عبدالرزاق (م ۶۰۳ھ) بن شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کی اولاد سے ہیں اور ایک سو پچاس[۱۵۰] سال کی عمر پاکر بوقت ظہر ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۳۲ھ کو فوت ہوئے[۱۵]۔ خارقہ پانزدہم[۱۵] تا بیست و ششم[۲۶] حیدر ولی کی اولاد کا تذکرہ ہے۔ خارقہ بیست و ششم[۲۶] میں حیدر ولی کے پوتے شاہ درویش قادری[۱۶] کی کرامات قلم بند ہوئی ہیں۔ شاہ درویش قادری شاہ نوراللہ قادری بیجاپوری کے بھتیجے اور مرید تھے اور ۱۰۹۰ھ میں بقید حیات تھے۔

اردو مکالمہ

شاہ درویش قادری جس شہر میں مقیم تھے (مصنف نے شہر کا نام نہیں لکھا مگر اغلب ہے کہ بیجاپور ہوگا) وہیں شاہ عنایت نام کا درویش بھی رہتا تھا۔ اسے شاہ درویش قادری سے ملنے کا اشتیاق تھا مگر پاؤں سے معذور ہونے کے باعث ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب شاہ درویش کو شاہ عنایت کے اس شوق اور معذوری کا علم ہوا تو وہ خود بھیس بدل کر شاہ عنایت کے تکیے پر پہنچے۔ ان دونوں کے مابین جو مکالمہ ہوا وہ صاف اردو میں ہے اور مصنف نے اصل الفاظ میں نقل کیا ہے۔ پورا واقعہ پڑھیے:

"(شاہ درویش قادری) چون نزدیک تکیہ رسیدند صاحب تکیہ را دیدند کہ بہ طریق آزادگان کاسہ ای پُر از بنج (کذا، بنگ؟) در پیش نہادہ و چپاتی بہ ہر دو دست گرفتہ می مالید۔ چون آن حضرت بہ آن بزرگ دوچار شد چنین فرمود کہ: اللہ اللہ ابی عنایت او ہم بہ تعظیم گفت مولیٰ بیائید و بنشینید۔ باز آن حضرت فرمود: ابی عنایت سمجھتا ہے کچ۔ بہ مجرد گفتن ایشان بہ خوب تر وجہ نگاہی کرد و چنین فرمود: سمجھتا ہوں کہ کوئی قادر ہے۔ بہ مجرد گفتن او آنحضرت چنین فرمود: بھلا ہم دھاد مار آتے ہیں۔ و در اصطلاح آزادگان کنایت از این حرف بول و تناسل کردن است۔"

(شاہ درویش قادری) جب تکیے کے قریب پہنچے تو صاحب تکیہ کو دیکھا کہ آزاد منش درویشوں (ملنگ) کی طرح بھنگ سے بھرا پیالہ سامنے رکھے ہوئے ہے اور دونوں ہاتھوں سے ایک ٹنڈا پکڑے رگڑ رہا ہے۔ جب شاہ درویش اس بزرگ کے پاس آئے تو یوں فرمایا "اللہ اللہ ابے عنایت" اس نے بھی احترام سے کہا صاحب آیئے تشریف رکھیے۔ شاہ درویش نے دوبارہ فرمایا: "ابے عنایت سمجھتا ہے کچھ" یہ کہنا تھا کہ عنایت نے شاہ درویش کو غور سے اچھی طرح دیکھا اور یوں فرمایا: "سمجھتا ہوں کہ کوئی قادر ہے"۔ اس کا یہ جواب سننا تھا کہ شاہ درویش نے فرمایا: "بھلا ہم دھاد مار آتے ہیں"۔ ملنگوں کی اصطلاح میں دھار مارنے سے مراد بول کرنا ہے۔

برصغیر کے صوفیا کے فارسی تذکروں اور فارسی ملفوظات کی کتابوں میں ہمیں صوفیا کے مقامی لہجوں اور زبانوں میں ایسے کئی مفرد جملے ملتے ہیں جو اردو زبان کی تکوین و تشکیل کا عمل سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں اور اردو زبان کے محققین نے اس طرف توجہ دی ہے[6]

منتخبات روضۃ الاولیا روضۃ الاولیا یا تذکرۂ اولیائے دار الظفر بیجاپور محمد ابراہیم زبیری کی تصنیف ہے جو ۱۲۴۱ھ/ ۲۶ - ۱۸۲۵ء میں لکھی گئی۔ یہ بھی بیجاپور کے اولیا راللہ منجملہ وہاں کے قادری مشائخ کا تذکرہ ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (شمارہ تذکرہ ۲۶۶) میں اور دوسرا اسٹیٹ آرکائیوز آف اندھرا پردیش اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری حیدرآباد (شمارہ ۱۹۶) میں ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر اس کا ملخص ہے جو معلوم نہیں کس نے تیار کیا۔ اس میں بیجاپور کے متعدد صاحبِ تصنیف بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ از آنجملہ:

۱۔ سید شاہ ابوالحسن قادری ثانی (م ۱۱۳۰ھ) مصنفِ مخزن سلاسل قادریہ۔

۲۔ سید عبدالرحمان معروف بہ میاں صاحب، مصنفِ نفس رحمانی: یہ سید محمد مدرس بیجاپوری (م ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۲۰ھ) کے منجھلے صاحبزادے اور سجادہ نشین تھے، نفس رحمانی سید عبدالرحمان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو شیخ موسیٰ بن شیخ داؤد نے تحریر کیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ راقم السطور نے قومی عجائب گھر پاکستان کراچی (شمارہ ۵/۳۳ - ۱۹۵۸ ن م) میں دیکھا ہے[7]

۳۔ شیخ علی محمد ابن سید عبدالرحمٰن مذکور: یہ تجلیات رحمانی کے مصنف ہیں جس کا ایک نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (شمارہ تصوف ۲۸) میں ہے[8]۔

انھوں نے نفس رحمانی کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۴۔ قاضی سید علی محمد (م ۵ ذیقعدہ ۱۰۷۰ھ، مادۂ تاریخ وفات "ستون دین فتادہ" ہے) ان کے دو بیٹے شاہ کریم اللہ اور شاہ نور اللہ تھے۔ ان کے بارے میں مصنف لکھتا ہے:

"ہر دو بزرگوار حاوی فضائل انسانی بودہ اند، خصوصاً سید شاہ نور اللہ کہ سرآمد دوران بودہ و انشای فارسی ایشان مقبول و مطبوع فضلا است و سلاطین زمانش سلطان محمد عادل شاہ و علی عادل شاہ بزرگی و اعزاز کمال مرعی می داشتند و احوال و کمالات ایشان در تواریخ عادل شاہیان مبیّن است۔ بر بازوی قبر والد ماجد خود جانب شرق مقبور ہستند۔"

اس اقتباس میں شاہ نور اللہ کی فارسی انشا کی مقبولیت کا ذکر ہوا ہے۔ پاکستان میں انشائے نور اللہ کے متعدد مخطوطات موجود ہیں[9]۔ اس انشا میں مصنف نے خود کو بندۂ عاجز نور اللہ لکھا ہے اور اپنے بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا۔ سید شرافت نوشاہی مرحوم (م ۱۴۰۳ھ) کو انشائے نور اللہ کا ایک نسخہ محمد عالم نوشاہی رسول نگری (ضلع گوجرانوالہ) کے ہاں ملا اور خیال کیا کہ یہ نور اللہ نوشاہی مفتی رسول نگر (م ۱۲۲۹ھ) کی تصنیف ہے[10] مگر اس نظریے کی تائید میں اور کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ احقر کا خیال یہ ہے کہ انشائے نور اللہ کے مصنف سید نور اللہ بیجاپوری ہو سکتے ہیں جن کی انشا کی پسندیدگی کی شہادت موجود ہے اور اس کے نسخے اب تک ملتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

حواشی

۱؎ ممتاز مخطوطہ شناس اور فہرست نویس استاد احمد منزوی نے بھی یہ مخطوطہ مجددی صاحب کے پاس دیکھا تھا اور اس کا تعارف اپنی قابل قدر تصنیف فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان کی جلد یازدہم[11] صفحہ ۹۲۳ پر کیا ہے اور کاتب کا نام ہلال الدین نبیرہ قادری اور تعداد صفحات ۲۸۶ بتائی ہے۔ ۲؎ پیش نظر مخطوطہ میں تاریخ تکمیل ۱۱ ربیع الاول ۱۰۰۹ھ لکھی ہے مگر یہ صاف سہو قلم ہے۔ ۳؎ بیجاپور کے صوفیا پر نہایت تحقیقی کتاب امریکہ سے شایع ہوئی ہے، ملاحظہ ہو: Richard Maxwell Eaton: Sufis of Bijapur 1300-1700, Princeton 1978، مگر اس کے آخذ میں خوارقات الحیدریہ شامل نہیں ہے۔ ۴؎ خوارقات الحیدر، خارقہ چہاردہم[14]۔ ۵؎ پاکستان کے قومی عجائب گھر، کراچی میں راقم الحروف نے ایک بزرگ شاہ درویش محمد قادری کے کچھ فارسی رسائل تصوف دیکھے ہیں (عارف نوشاہی، فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزہ ملی پاکستان، ص ۴۹۹ بہ مدد اشادیہ) مصنف کا زمانۂ حیات متعین نہیں ہے۔ ۶؎ جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو، جلد اول کے دوسرے باب میں نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ۷؎ رچرڈ ایم ایٹن، صوفیز آف بیجاپور، ۳۳۵ ۸؎ وہی حوالہ، ص ۲۰۶ ۹؎ احمد منزوی، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، ج ۵ ص ۹، ۴۷۔ ۴۸۰ ۱۰؎ شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، ج ۲ ص ۴۴۹۔

عبّاس محمودُ العقادؔ

از جناب ابوسفیان اصلاحی

عباس محمود ابراہیم مصطفےٰ عقاد بیسویں صدی کے مشہور مصری ادیب و نقاد ہیں جن کے گہرے اثرات اس عہد کے عربی ادب پر پڑے ہیں، وہ ایک حقیقت پسند ادیب تھے، ان کے نزدیک ادب کو صداقت، خلوص اور محبت کا آئینہ دار، احساسات و جذبات کا ترجمان اور فطرت و کائنات کے مشاہدات کا عکاس ہونا چاہیے، عقاد اپنے عہد و ماحول سے بیگانہ ادب کو لفظی بازیگری سمجھتے تھے۔ انہیں اپنے اس ادبی نظریہ پر مکمل شرح صدر تھا اس لیے اس کی مخالفت میں اٹھنے والی کسی آواز کی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔

عقاد ایک اچھے صحافی اور بلند پایہ مقالہ نگار بھی تھے، انھوں نے متعدد رسالے نکالے اور دوسرے مصری جرائد و رسائل میں بھی ان کے مقالات شایع ہوئے جو ادب، تنقید اور سیاست جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔

عقاد کی تعلیم واجبی تھی لیکن اپنی فطری صلاحیت اور ذاتی محنت سے انھوں نے عربی اور مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کر کے نثر و نظم کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی، فلسفیانہ ذہن کے مالک بھی تھے، جس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑا۔

عقاد کے والدین عباس محمود العقاد "اسوان" کے ایک متوسط گھرانے میں

۲۸ جون ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے[1] ان کا اصل تعلق "دمیاط" سے تھا، انکے والد دیندار اور شریعت کے متبع تھے وہ نماز کا بڑا اہتمام کرتے اور اپنے لڑکے کو بھی اس کی بڑی تاکید کرتے تھے، عقاد کا بیان ہے کہ "مجھے ہر وقت نماز کی تاکید کرتے چنانچہ میں دس سال کی عمر میں نماز کا پابند ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ جب فجر کی نماز پڑھنے سے میں نے انکار کیا تو وہ عصا لے کر مجھ پر پل پڑے[2]"، عقاد جب اپنے والد کو وہ قصائد سناتے جو انھوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہے ہیں تو فرط مسرت سے ان کے والد کا چہرہ کھل اٹھتا[3]۔ دینداری کی وجہ سے اپنی آمدنی کا حساب کرکے اس کی زکوٰۃ نکالتے اور خاموشی سے ان مستحقین کو پہنچا دیتے جنھیں دست سوال دراز کرنے کی عادت نہ ہوتی۔ اگر کوئی فقیر ان کے دروازے پر آکر کھانے کا سوال کرتا تو اسے بغیر کھلائے واپس نہ جانے دیتے۔

عقاد کے والد کی تعلیم زیادہ نہ تھی اور وہ صرف دینی ومذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، اپنے گھر والوں کو بھی لغو باتوں اور فرضی داستانوں میں اپنا وقت ضایع کرنے سے منع کرتے۔ عقاد کو اپنے والد کے پاس عبداللہ ندیم (۱۸۴۵-۱۸۹۶م) کے اخبار "الاستاذ" کے بہت سے شمارے ملے۔ جس کے مطالعہ سے ان کے قومی جذبات بیدار ہوئے[4]

---

[1] عباس محمود العقاد۔ انا۔ دارالہلال (بدون تاریخ) ص۔ ۳۰ نیز ملاحظہ کریں شوقی ضیف۔ مع العقاد۔ دارالمعارف۔ مصر (بدون تاریخ) ص ۱۱ ....

.... [2] ایضاً ص ۳۳ [3] ایضاً ص ۳۳ [4] ایضاً ص ۳۵۔

عقاد کے والد محمد ابراہیم مصطفےٰ العقاد "اسوان" کے ریکارڈ آفس میں انچارج تھے۔ ان کی کارکردگی لائق ستایش تھی۔ وہ ایک اچھے منتظم تھے۔ یہی تنظیم و تنسیق عقاد کو وراثت میں ملی۔ وہ خالص مصری النسل تھے۔ ان کے جد امجد "دمیاط" کے ایک ریشم کے کارخانہ میں ملازم تھے، اسی وجہ سے اس خاندان کے لوگوں کو "العقاد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے[1]

عقاد کی والدہ کردی النسل تھیں۔ جن کو اپنے والدین سے تقویٰ اور سلامتی طبع وراثتاً ملی تھی۔ وہ شروع ہی سے صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں انہیں گھریلو کاموں میں مہارت تھی، وہ اپنے لڑکوں کی تربیت پر بڑی توجہ دیتی تھیں[2]۔

عقاد کی تعلیم اور انکے اساتذہ

سات سال کی عمر میں عقاد "اسوان" کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے[3] ان کی تعلیم اسی مدرسہ تک محدود رہی کیونکہ اسوان اور دوسرے شہروں میں کوئی ثانوی مدرسہ نہ تھا[4]

ابتدائی تعلیمی مرحلے میں عقاد نے دو اساتذہ سے خاص طور پر استفادہ کیا۔ ایک استاد سے ارادتاً مستفیض ہوئے اور دوسرے سے بلاارادہ۔ ایک کا نام شیخ محمد فخرالدین تھا جو عربی زبان اور تاریخ کے استاد تھے۔ دوسرے کا نام انھوں نے نہیں بتایا یہ حساب، ہندسہ اور ریاضی کے استاد تھے۔ اور اوہام وخرافات کے قائل تھے۔ انہیں اپنے مضمون پر اچھی دستگاہ حاصل نہ تھی[5]۔

وہ اپنے تمام اساتذہ میں شیخ احمد الجداوی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے۔

---

[1] مع العقاد ص ۱۱ نیز ملاحظہ ہو "انا" ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۴۱ [3] مع العقاد ص ۱۱۔

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ فی صحبۃ العقاد ص ۲۴-۲۵ [5] انا ص ۵۸۔

جن کے پاس انہیں ان کے والد نے بھیجا تھا۔ ان کا تعلق "اسوان" سے تھا اور وہ
ازہر کے فارغ التحصیل تھے۔ یہ شیخ محمد عبدہ کے ساتھیوں میں تھے اور انہیں کی
طرح جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے۔

ذہانت و فطانت

عقاد کی ذہانت و فطانت کا اندازہ لوگوں کو ان کے اسکول
ہی کے زمانے سے ہونے لگا تھا۔ ایک بار اسکول میں مصطفیٰ کامل (۱۹۰۸ء-۱۸۷۴ء)
آئے اور انھوں نے امتحان کے لیے بلیک بورڈ پر ایک شعر لکھ کر طلبہ سے اسکا
مطلب دریافت کیا۔ لیکن کلاس کے تمام طلبہ اس کا مفہوم بتانے سے قاصر رہے۔
پیچھے بیٹھے ہوئے عقاد کی باری آئی تو انھوں نے نہایت متانت کے ساتھ
اس کا درست مفہوم بتادیا۔ اس پر عقاد کو مصطفیٰ کامل کی طرف سے
حوصلہ افزائی کی سوغات ملی[1]

طالب علمی کے زمانہ ہی سے عقاد نے انشائیے لکھنا شروع کر دیا تھا کیونکہ
ان کی خواہش تھی کہ اہل علم و ادب کی طرح وہ بھی معاشرہ میں ایک بلند مقام
پر فائز ہوں۔ اسوان کے اسکول میں جب وہ طالب علم تھے تو اس وقت
انھوں نے متعدد انشائیے لکھے تھے جن میں انھوں نے عموماً دو متضاد چیزوں
کے درمیان موازنہ کیا ہے، مثلاً ایہما الافضل المال او العلم (مال اور علم میں
کس کو ترجیح ہے)۔ الذہب او الحدید (سونا یا لوہا میں کون بہتر ہے)۔ الصیف
او الشتاء (گرمی اور جاڑے میں کس کو فضیلت ہے)۔ الرای او الشجاعۃ (رائے
اور بہادری میں کس کو فوقیت ہے) السیف او القلم (تلوار افضل ہے یا قلم)

[1] فی صحبۃ العقاد ص ۲۵۔

الحرب او السلم (جنگ اور صلح میں کون بہتر ہے) وغیرہ۔ عقاد لکھتے ہیں:

"میری عادت تھی کہ موازنہ میں ہمیشہ کمزور پہلو کو لیتا۔ ایک بار علم اور جہل کے
مقابلے میں میں نے جہل کی وکالت کی۔ جس کو ہمارے استاد شیخ فخر الدین نے
بہت پسند کیا اور میری کاپی بڑے لوگوں کے سامنے پیش کی۔ میری کاپی ایک بار
شیخ محمد عبدہ کے سامنے پیش کی گئی تو صفحات پلٹ کر مسکرانے لگے اور موازنہ پر
مجھ سے مناقشہ کرنے کے بعد فرمایا" ما اجدر ھذا ان یکون کاتبا بعد[1]
(یہ آئندہ انشاپرداز ہونے کے بہت لائق ہیں)

عقاد شیخ محمد عبدہ کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ اپنی آپ بیتی میں رقمطراز ہیں:
مصر اور اس سے متصل دوسرے ملکوں میں پانچ صدیوں میں جو اشخاص پیدا
ہوئے ہیں ان میں شیخ محمد عبدہ کی شخصیت سب سے قدآور ہے۔ میرے اوپر
ان کا نہایت گہرا اثر ہے۔ ہمارے شہر اسوان میں انہیں قدر و منزلت کی
نگاہ سے دیکھا جاتا۔ جبکہ وہاں ان کے بہت سے حاسد بھی موجود تھے۔
کیونکہ جہلا انکے علم و فضل سے خار کھاتے تھے[2]

عقاد کی دوسری محبوب شخصیت سعد زغلول (۱۸۵۷-۱۹۲۸ء) ہیں۔
جبکہ اس وقت کے نوجوان مصطفیٰ کامل اور عبدالعزیز جاویش کے شیدائی تھے
اور سعد زغلول پر تنقید کرتے تھے۔ ایک روز وہ "دیوان المحارت" میں سعد
زغلول کے نظریات سے واقف ہونے کے لیے ان کے پاس گئے، اور جیسے ہی
لائبریری میں داخل ہوئے انھوں نے اٹھ کر استقبال کیا اور سامنے پڑی ہوئی

[1] انا ص ۸۰ [2] ایضاً ص ۹۴۔

کرسی پر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ جب یہ بیٹھ گئے تو انھوں نے کہا کہ کیا شیخ محمد عبدہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں میں نے ان کے رسائل، تفاسیر و سوانح کا مطالعہ کیا ہے۔ فرمایا کہاں کیا ازہر میں؟۔ میں نے کہا کہ نہیں بلکہ اسوان میں۔ میرے استاد نے ان کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں اور شیخ محمد عبدہ نے خود میری طالب علمی کے زمانے میں میرے سبق اور بعض انشائیوں کے متعلق مجھ سے مناقشہ کیا ہے، علاوہ ازیں میں نے ان سے ایک جانفزا مژدہ بھی سنا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا وہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ ایک بار استاد محترم میری طرف متوجہ ہوئے اور میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے فرمایا "ما اجدر هذا ان یکون کاتبا بعد" (یہ آئندہ انشاپرداز ہوگے)، اس پر سعد زغلول پاشا مسکرائے اور کہا "اری ان نبوة الامام تتحقق"[1] (میرا خیال ہے کہ امام عبدہ کی پیشین گوئی درست ہوگی)

علم و ادب سے دلچسپی عقاد کو ادب سے فطری لگاؤ تھا وہ ادب و ثقافت کے ذریعہ ہی عزت و کرامت کے خواستگار تھے اور اہل علم کو امراء سے ممتاز اور فائق خیال کرتے تھے، ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۹ سال کی عمر میں ہو گیا تھا انہیں علم سے اس قدر شغف تھا کہ اپنا پہلا قصیدہ علوم کی تعریف ہی میں تحریر کیا تھا[2]

علم الحساب له مزايا جمة　　وبه يزيل المرء في العرفان
والنحو تنظرة العلوم جميعا　　وهبين غامضها وخير لسان[3]

[1] انا ص ۶۵ - ۶۶ [2] ایضاً ص ۳۰ [3] ایضاً ص ۳۰۔

عقاد نے اپنی علمی و ادبی لیاقت بڑھانے کے لیے الابشیہی کی کتاب "المستطرف من کل فن مستظرف" زہیر کا "دیوان البھا" اور "الف لیلہ و لیلۃ" کے قصے نیز بستانی کی "دائرۃ المعارف" کا مطالعہ کیا[1]۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرے سامنے مجلہ "الاستاذ" کے بہت سے شمارے اور عبداللہ ندیم کے دوسرے رسائل بھی تھے۔ "ابونضارہ" اور "العروۃ الوثقیٰ" کے بھی کچھ شمارے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے انقلابی مواد بھی موجود تھے جنھیں اسوقت خفیہ طریقہ سے تقسیم کیا جاتا تھا۔"

عقاد نے "الاستاذ" کی طرح ایک رسالہ "التلمیذ" نکالا جس کا آغاز اپنے مقالہ "لو کنا مثلکم لما فعلنا فعلکم" سے کیا۔ یہ مقالہ عبداللہ ندیم کے مقالہ "لو کنتم مثلنا لفعلتم فعلنا" کے مقابلے میں لکھا گیا تھا یہیں سے ان کا میلان شاعری اور مسجع نثر لکھنے کی طرف ہوا[2]۔

انگریزی زبان کی تحصیل عقاد کو انگریزی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس کا آغاز "توماس کارلائل" کی کتاب سے کیا اور ڈکشنری کی مدد سے اسے پورا پڑھ ڈالا[3]۔ اسوان کے اسکول میں انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنی انگریزی کی استعداد بڑھائی اور موسم سرما کی چھٹیوں میں غیر ملکی بک اسٹالوں پر اپنی فہم کے مطابق اخبارات و رسائل خریدتے۔ مدرسہ میں آنے والے سپاہیوں سے وہ اور ان کے احباب انگریزی میں گفتگو کرتے۔ ان کی عورتوں اور بچوں سے بھی انگریزی ہی میں بات چیت کرتے۔ اس طرح انکی

[1] مع العقاد [2] انا ص ۷۰ [3] فی صحبۃ العقاد ص ۲۶۔

انگریزی کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک اسوان میں انگریز فوجی حکام اپنے سرکاری کاغذات کے ترجمے بھی عقاد اور ان کے ساتھیوں سے کراتے۔ صبح و شام ان کے ہاتھوں میں انگریزی اخبارات ہوتے جنھیں وہ اور ان کے ساتھی ان سے لے کر پڑھتے اور کبھی خبریں بھی آپس میں ایک دوسرے کو سناتے، اس طرح انگریزی زبان سے عقاد کی اچھی خاصی واقفیت ہوگئی اور اس بنیاد پر انھوں نے مغربی ادب کے خزانوں تک رسائی حاصل کی۔[1] انھوں نے اسپینش اور اطالوی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں۔[2]

شوق مطالعہ

عقاد کی پوری زندگی کتابوں کی ورق گردانی میں گزری کیونکہ علمی و ادبی میدان ہی ان کی دلچسپی کا تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنی لائبریری میں محو مطالعہ رہتے اور لوگوں سے بہت کم ملتے تھے انھوں نے لوگوں سے ملاقات کے لیے جمعہ کے دن صبح کا وقت مقرر کر لیا تھا، ان کی لائبریری میں مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات کی کتابیں تھیں مثلاً فرانسیسی، انگریزی، عربی، فلسفہ، طبیعیات، کیمیا، ریاضیات، فلکیات، نباتات، ادب، تنقید، سیرت، تاریخ اور دواوین وغیرہ۔ ان کی لائبریری میں مختلف قوموں، مختلف زبانوں اور مختلف ادوار کے دواوین موجود تھے۔ ان تمام کتابوں کو انھوں نے نہ صرف پڑھا بلکہ ان پر حواشی بھی لکھے۔[3]

۱؎ مع العقاد ص ۱۶-۱۷ ۲؎ محمد راشد ندوی۔ جدید عربی نثر نگاری اور عباس محمود العقاد (فکر و نظر۔ جنوری تا مارچ ۱۹۸۰ء ۱۷/ ۱۵ ص ۵۸) ۳؎ محمد خلیفہ التونسی (مرتب) العقاد دراسۃ وتحیۃ۔ مکتبۃ الانجلو المصریۃ (بدون تاریخ) ص ۱۹۱۔

مذہبی فلسفہ، طبیعی تاریخ اور عظیم شخصیات کی سوانح و شاعری جیسے موضوعات عقاد کے نزدیک قابل قدر تھے۔ ان موضوعات کی تالیفات و تصنیفات کو وہ دلچسپی سے پڑھتے۔ یہ بظاہر موضوع کے لحاظ سے علٰحدہ نظر آتی ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ ان میں مماثلت اور ہم آہنگی ہے۔[1]

عقاد کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ طالب علمی کے عہد میں آدھی رات تک چراغ کی روشنی میں مطالعہ میں غرق رہتے۔ آگے عقاد کہتے ہیں کہ "میرے گھر والے جانتے کہ میں درسی کتب کے مطالعہ میں محو ہوں جبکہ میں کبھی کوئی دیوان کبھی الف لیلہ و لیلہ کا کوئی قصہ اور کبھی ماہنامہ رسائل المقتطف، الهلال، المحیط اور المفتاح وغیرہ کے صفحات میں گم رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی مجھے طالب علم بننے کا شوق دامنگیر رہا۔"[2]

ملازمت

عقاد نے اپنی ملازمت کا آغاز ضلع "الفیوم" میں "قلم القید" سے کیا لیکن یہ راس نہ آئی اور صدر و سکریٹری سے ان بن ہو جانے کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔ اس پر ان کے والد اور بہت سے لوگوں نے لعن طعن کی، کیونکہ اس وقت سرکاری ملازمت بڑی مشکل سے ملتی تھی۔[3] اس کے بعد ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک وزارت اوقاف میں رہے لیکن وہاں سے بھی استعفا دے دیا۔[4] اور اسوان جاکر مطالعہ میں غرق ہو گئے۔[5] اس کے بعد قاہرہ آئے اور وہاں کے ثانوی مدرسہ سے وابستہ ہوئے جہاں مازنی بھی تھے لیکن مدرسہ کی بدنظمی اور بے ترتیبی

۱؎ العوضی الوکیل۔ العقاد ناثراً ص ۱۷ (العقاد دراسۃ وتحقیق) ۲؎ ایضاً ص ۹۵ ۳؎ فی صحبۃ العقاد ص ۳۵ ۴؎ ایضاً ص ۳۸ ۵؎ ایضاً ص ۳۹۔

نے یہاں سے بھی رخت سفر باندھنے پر مجبور کردیا۔ ان دنوں عقاد اور مازنی تنگدستی
اور عسرت سے گزر کر رہے تھے۔ ان کے دوست شکری کو جب یہ معلوم ہوا تو
وہ بہت ملول ہوئے[1] عقاد کی وابستگی جب اسوان کے ایک مدرسہ سے ہوئی جو
انہیں بہت راس آیا۔ کیونکہ وہ اس مدرسہ کے مختار کل تھے اور مدرسہ بھی انکے
حسن انتظام سے شاہراہ ترقی پر گامزن تھا[2]

عقاد بار بار ملازمت سے اس لیے مستعفی ہوتے تھے کہ وہ ایک خوددار اور
غیرت مند شخص تھے۔ انھوں نے ملازمت کو غلامی کی زندگی سے تعبیر کیا ہے اور بتایا
ہے کہ بیسویں صدی کا سب سے مظلوم ترین انسان ملازم ہے[3]۔ انہیں آزادانہ زندگی
بہت پسند تھی اس لیے کسی قسم کی پابندی اور کسی کی محکومی گوارا نہ تھی۔ وہ ایک حساس
ادیب، شاعر، ناقد اور فلسفی تھے اس لیے وہ تمام چیزوں کو محسوس کرلیتے اور
چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی کلفت واذیت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان کی پوری زندگی
ادب کے لیے وقف تھی۔ اس کے وسیلہ سے وہ حریت اور آزادی کے لیے آواز
بلند کرتے رہے اور ان کا قلم ظلم و تشدد کے خلاف نبرد آزما رہا[4]

عقاد کا ادبی و تنقیدی سرمایہ

عقاد نے ادب و تنقید اور مقالہ نگاری کی صنف میں
قابل قدر چیزیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی تصانیف کو
تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ شعری دواوین ۲۔ مقالات، محاضرات
اور تقاریر وغیرہ ۳۔ متعین موضوع پر تصنیفات۔ اس کے علاوہ ان کے

---

[1] فی صحبۃ العقاد ص ۴۰ [2] ایضاً ص ۴۲ [3] انا ص ۷۰ [4] الدکتور عثمان امین۔
الجوانیۃ فی ادب العقاد (العقاد دراسۃ وتحقیق ص ۴۹)

بہت سے ایسے مقالات بھی ہیں جو مختلف مصری رسائل وجرائد کے صفحات میں
دبے پڑے ہیں۔

بعض لوگوں نے عقاد کی کتابوں کی تعداد ۷۰ بتائی ہے، لیکن درحقیقت
یہ ۱۰۰ سے متجاوز ہیں۔ سوفیا خلیفہ التونسی کا کہنا ہے کہ ہماری لائبریری میں عقاد کی
موجودہ کتابوں کی تعداد ۹۹ ہے[1]

شاعری

گو عقاد بحیثیت شاعر زیادہ معروف نہیں ہیں، تاہم اس اعتبار سے بھی
ان کا ایک درجہ ضرور ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری ہی سے
کیا تھا۔ ان کی شاعری ایک خاص مقصد اور نقطۂ نظر کی حامل ہے اور انھوں نے
اس میں معاشرتی مسائل اور زندگی کی تصویرکشی کی ہے۔ شوقی کی شاعری پر
انھوں نے "الدیوان" میں اس لیے تنقید کی ہے کہ ان کی شاعری تجربات، انسانیت،
کائنات اور معاشرہ سے ماورا تھی۔

طہٰ حسین نے عقاد کو اپنے عہد کا اچھا شاعر قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے یہاں
وہ چیزیں ملتی ہیں جو دوسروں کے یہاں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری
میں اپنے عہد اور نئی نسل کے رجحانات کی ترجمانی کی ہے اور مصر کی قدیم وجدید
قدروں پر بھی اظہار خیال کیا ہے[2]۔ ڈاکٹر زکی نجیب محمود نے عقاد کی شاعری کے
مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اس نے دنیوی اور عالم محسوسات
کی چیزوں کو تفصیل سے فلسفیانہ طرز پر بیان کیا ہے۔ وہ عقاد کی شاعری کی

---

[1] سوفیا خلیفہ التونسی۔ مولفات العقاد (العقاد دراسۃ وتحقیق ص ۳۰۸-۳۰۹)
[2] ایضاً ص ۲۲۷۔

تشبیہ حسین وجمیل عمارتوں سے دیتے ہیں[1]

عقاد کی سیاسی زندگی

وہ سیاست میں اس لیے نہیں گئے تھے کہ کسی منصب کو حاصل کریں بلکہ وہ وہی لکھتے جسے سچ سمجھتے اور جس پر انہیں کامل یقین واعتماد ہوتا۔ ان کی سیاست سے وابستگی دو[2] اسباب کی بنا پر تھی ایک تو اپنی معیشت کو بہتر بنانا دوسرے اپنے وطن کی خدمت اور ملک کے اندر حریت وجمہوریت کا فروغ[3] انھوں نے ان تمام لوگوں پر تنقید کی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور جو عوام کے خون وپسینہ سے داد عیش دے رہے تھے، وہ اپنی سوانح میں رقمطراز ہیں کہ" میں نے سرکشی، ظلم وبربریت، سرمایہ داروں، تخریب کاروں سے جنگ کی۔ اندھی تقلید کرنے والوں اور مذہب کے نام پر لوگوں کو فریب دینے والوں سے برسرپیکار رہا اور رجعت پسندوں سے عداوت مول لی۔ ہٹلر، نپولین اور جمہوریت کے دشمن سامراجیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ صیہونیت اور نازیت کے خلاف میرا قلم رواں رہا[4] اور میں نے اشتراکیت پر بھی شدید تنقید کی[5]

صدقی پاشا کی حکومت جمہوریت کا گلا گھونٹ رہی تھی اور عوام پر ظلم وستم ڈھا رہی تھی اس لیے عقاد نے ایک کتاب" الحکم المطلق فی القرن العشرین" تصنیف کی، جس میں صدقی پاشا کی مذمت بیان کی[5] اس کی وجہ سے ان کو جیل میں ڈالدیا گیا اور وہ ۹ ماہ تک قید کی مشقتیں برداشت کرتے رہے[6] لیکن سختیاں

---

[1] سوفیا خلیفہ التونسی۔ مولفات العقاد (العقاد دراسة وتحقيق ص ۱۴۱) [2] فی صحبة العقاد ص ۸، [3] ایضاً ص ۱۲۸ [4] النثر العربي المعاصر ص ۲۳۱ [5] الادب العربي المعاصر فی مصر ص ۱۳۸ [6] مع العقاد ص ۴۲۔

جھیلنے کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے نظریات وخیالات کا سودا نہیں کیا وہ اپنے مقالات اخبارات میں اس شرط کے ساتھ اشاعت کے لیے دیتے تھے کہ ان میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جائے گی[1]

عقاد کو" الوفد" پارٹی سے بڑا تعلق تھا کیونکہ اس کے صدر سعد زغلول تھے جو آزادی رائے کے علمبردار تھے۔ اس بنا پر وہ" حزب الوفد" کے بڑے مداح اور اس تحریک کے روح رواں سعد زغلول کی ذہانت، قیادت، اخلاص اور جد وجہد سے بہت متاثر ہوئے خود سعد زغلول بھی عقاد کے افکار ونظریات اور ان کی تحریروں اور طرز بیان کو بہت پسند کرتے تھے۔ حزب الوفد کی پرجوش تائید کی وجہ سے عقاد کو" حزب الوفد" کا ترجمان کہا جانے لگا تھا[2] مگر جب انھوں نے دیکھا کہ" الوفد" اپنے مقاصد سے منحرف ہوگئی ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہوگئے گو انکے یہ اختلافات جزوی تھے[3]

عقاد کے سیاسی مقالات" الجریدة" (احمد لطفی السید)" الظاہر" (ابوشادی وکیل) اور انکے علاوہ" المؤید" اور" اللواء" میں شایع ہوتے رہے[4]" الدستور" سے روز اول سے اسوقت تک وابستہ رہے جب تک یہ نکلتا رہا[5] اس کے بعد" الاہالی" اخبار سے وابستہ ہوئے جس کو محمد پاشا سعید نکالتے تھے۔" الاہرام" سے بھی وابستہ ہوئے، لیکن خرابیٔ صحت نے انہیں اس اخبار سے وابستہ نہ رہنے دیا۔ اس کے بعد یومیہ اخبار" البلاغ" سے وابستہ ہوئے اور اس اخبار سے مدة العمر وابستہ رہے[6] اور" وفد" سے علیحدہ ہونے کے بعد جریدہ" الاساس" میں لکھتے رہے[7]

عقاد کے سیاسی مقالات کے مطالعہ سے اس وقت کی سیاسی اور سماجی زندگی کی واضح تصویر سامنے آتی ہے چونکہ انکا سیاسی نقطۂ نظر ہمیشہ عوام اور معاشرے کے مفاد پر مبنی ہوتا تھا اسی لیے انہیں ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء کو جیل جانا پڑا۔ (باقی)

---

[1] فی صحبة العقاد ص ۹۰ [2] النثر العربي المعاصر ص ۳۰۴ [3] ایضاً ص ۳، [4] فی صحبة العقاد ص ۸۶ [5] ایضاً ص ۸۹ [6] الادب العربي المعاصر ص ۱۳۸۔

سوئے حرم

از ضیاء الدین اصلاحی

(سلسلہ کے لیے دیکھیے معارف جولائی ۹۲ء)

ہم لوگوں نے تمتع کی نیت کی تھی، یہ امام دار الہجرۃ کا مسلک ہے جس پر اب عموماً احناف بھی عمل کرتے ہیں راقم نے ۳۰ مئی کو دہلی ایرپورٹ پر مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر عمرہ کا احرام باندھ لیا تھا، ۳۱ مئی کو طلوع آفتاب کے بعد جدہ سے منیٰ کے لیے روانہ ہوئے تو ہماری گاڑی میں تلبیہ کے ٹیپ کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ہم سب لوگ اپنے طور پر تلبیہ کہہ رہے تھے، ہمارے ساتھی مولوی معین الدین ڈار کشمیری بڑے موثر اور پرسوز آواز میں تلبیہ کہہ رہے تھے جس کو سن کر ہماری آنکھیں ڈبڈبا آئیں، جدہ سے منیٰ جاتے ہوئے دل و دماغ پر یہی خیالات چھائے رہے کہ یہ وہ سرزمین ہے جس سے پوری دنیا کو اسلام و ایمان کی دولت اور رشد و ہدایت کی توفیق ملی تھی اور جب تک ہم اس دولت کے قدر شناس رہے اس وقت تک ہماری حالت کیا تھی؟ اور اب کیا ہوگئی ہے۔

مکہ مکرمہ سے گزرنے لگے تو سیدنا محمد عربی فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ نے چودہ سو برس قبل یہیں اسلام و ایمان کی دعوت لوگوں کو دی تھی تو اپنے پرائے سب آپ کی جان کے پیچھے پڑ گئے تھے اور آپ کے جاں نثاروں کو اسی ریتیلی اور پتھریلی تپتی ہوئی زمین پر لٹا کر طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، جی تو چاہتا تھا کہ یہاں سر کے بل چلیں اور انہیں راہوں میں اپنا سر توڑ دیں جہاں سے

کاروان حق و صفا گزرا تھا ع یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآئی

تھوڑی دیر میں مکہ معظمہ کے بعد ہم منیٰ میں مسجد خیف کے پیچھے رابطہ کے مہمان خانہ میں پہنچ گئے اور وہاں جب ایڈجسٹ (Ad Just) ہوگئے تو اس کی فکر ہوئی کہ ہمیں جلد سے جلد عمرہ سے فارغ ہولینا چاہیے، ظہر کی نماز میں معلوم ہوا کہ رابطہ نے ہم لوگوں کو حرم تک لے جانے اور لانے کے لیے گاڑی کا نظم کیا ہے جو عصر کی نماز اور چائے سے فراغت کے بعد ۵ بجے شام کو روانہ ہوگی۔

فقہی احکام و مسائل سے میری واقفیت بہت کم ہے، اس کی تلافی کے لیے میں اپنے ساتھ مولانا مختار احمد ندوی حفظہ اللہ امیر جمعیۃ اہل حدیث کا رسالہ "حج مسنون" لیتا گیا تھا جس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا، کان پور میں بھائی صاحب نے مولانا سعید احمد صاحب کی کتاب معلم الحجاج دی تھی، ڈاکٹر مسعود الرحمان خاں ندوی کے پاس مولانا محمد منظور نعمانی کی مقبول عام تصانیف "حج کیسے کریں" اور "آسان حج" تھیں ان سے بھی میں نے فائدہ اٹھایا اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن عمرہ و حج کے مسائل و احکام سے محض نظری واقفیت کافی نہیں ہے اس کے لیے عملی تجربہ اصل چیز ہے، اسی لیے میں پروفیسر مسعود سے طواف و سعی کے بارہ میں گفتگو کر رہا تھا، ہماری گفتگو سن کر مولانا عبد الرءوف ملک صاحب آگئے وہ بھی رابطہ کے مہمان اور لاہور سے تشریف لائے تھے اور ہمارے کمرے سے متصل دوسرے کمرے میں مقیم تھے، مولانا حنفی المسلک اور دیوبندی الفکر ہونے کے باوجود مولانا

امین احسن اصلاحی متعنا اللہ بطول بقائہ صاحب تدبر قرآن کے علم و فضل کے بڑے معترف اور انہیں اپنا مرشد کہتے تھے، وہ مولانا اصلاحی کے قرآن مجید اور حدیث نبوی کے درس میں بھی شریک ہوتے رہتے ہیں، ان کو مسائل حج سے بخوبی واقفیت بھی تھی اور یہ متعدد بار حج و زیارت کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے، انھوں نے بھی ہماری طرح تمتع کیا تھا اس لیے طے پایا کہ اس وقت عمرہ کے ارکان (طواف وسعی) اور آگے جملہ مناسک حج انہی کی رہنمائی اور رہبری میں ادا کیے جائیں، چنانچہ میں نے اور پروفیسر مسعود نے جب اس کے متعلق ان سے عرض کیا تو انھوں نے بطیب خاطر ہماری درخواست منظور کر لی اس طرح ہمارا قافلہ جو میرے اور پروفیسر مسعود خاں کے علاوہ جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، معین الدین ڈار، حسین امین، خورشید کامل قدوائی اور مولانا عبدالرءوف ملک کے تلمیذ و رفیق مولوی اشرف پاکستانی پر مشتمل تھا، انہی کی رہنمائی میں ۳۱ مئی کو مغرب سے پہلے عمرہ کے طواف وسعی کے لیے مکہ روانہ ہوا، میں خاموش طبع اور کم آمیز شخص ہوں اس لیے بہت دیر میں کسی سے بے تکلف ہوتا ہوں لیکن مولانا عبدالرءوف صاحب بہت جلد ہر شخص سے رسم و راہ پیدا کر لیتے تھے، رابطہ کی دعوت پر مختلف ملکوں سے جو لوگ حج کے لیے آئے تھے ان میں سے اکثر سے ان کی بے تکلفی اور اچھے تعلقات ہو گئے تھے چنانچہ ہر شخص انکی واقفیت اور تجربہ سے فائدہ اٹھا رہا تھا، ہم لوگ بھی ان کی نگاہ لطف کے امیدوار رہتے تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ہم لوگ وہاں رہے وہ برابر ہم پر لطف و شفقت فرماتے رہے اور ہر روز دو تین بار ہم لوگوں کے پاس آنے کے لیے وقت نکال ہی لیا کرتے تھے، میں ان کو دیکھ کر اکثر یہ مصرعہ پڑھا کرتا تھا

دامن پکڑ لیا ہے شبِ دراز کا

ان کے رفیق مولوی اشرف صاحب خاص طور سے مجھ پر مہربان تھے، عمرہ و حج کے ارکان و مناسک کی ادائیگی میں وہ میرے لیے خضر راہ بن گئے تھے، ان کی وجہ سے کبھی قافلہ سے بچھڑ جانے کی نوبت نہیں آئی۔

خانۂ کعبہ پر نظر پڑتے ہی اس کی عظمت و جلال کا ایسا نقش دل میں بیٹھا کہ آج بھی جب نگاہ تصور میں کعبہ ہوتا ہے تو دل کا عجیب حال ہو جاتا ہے،

تری محفلِ ناز سے جلنے والے نگاہوں میں تجھکو لیے جا رہے ہیں

اول اول جب خانۂ کعبہ پر نظر پڑی تو یہ دعا پڑھی کہ اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَّ تَعْظِیْمًا وَّ تَکْرِیْمًا۔

ایک طرف اگر اپنی قسمت پر رشک ہو رہا تھا کہ آج اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے اپنے گھر میں حاضری کی توفیق بخشی ہے تو دوسری طرف اپنی سراپا معصیت آلود زندگی کے تصور سے لرز رہا تھا کہ

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

بہرحال اب ہم لوگ خانۂ کعبہ کے قریب ہو چکے تھے، وہی کعبہ جو توحید اور خدا پرستی کا اولین مرکز اور ملت ابراہیمی اور دین محمدی کے پیروؤں کی عقیدت و نیاز کا قبلہ تھا۔ یہیں سے سارے عالم میں توحید کا غلغلہ بلند ہوا تھا اور اب تک کعبۃ اللہ کے در و دیوار سے صدائے توحید ہی بلند ہو رہی ہے اور یہاں کی کفر و شرک بیزار فضا میں حضرت ابراہیمؑ کا "کلمہ باقیہ" (یادگار بول) ابھی گونج رہا ہے۔

إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
حَنِيْفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ
(انعام - ۷۹)

میں نے اپنا رخ بالکل یکسو ہو کر
اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں
اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں
میں سے نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ جب اس گھر کی تعمیر کر رہے تھے اور خدا سے اس کے خیر و برکت اور امن و آسائش کے گہوارہ ہونے کی دعا کر رہے تھے تو ان پر عشق و مستی، سرشاری و دیوانگی اور فنائیت فی اللہ کی کیسی کیفیتیں اور ادائیں چھائی ہوئی تھیں لیکن ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ نہ توحید کا درس اور کفر و طاغوت سے نفرت کا سبق لے رہے ہیں اور نہ جنون و سرمستی اور دیوانگی و سرشاری کی کوئی ادا ہم میں دکھائی دیتی ہے، حالانکہ کعبہ کے چپہ چپہ سے نغمۂ توحید گونج رہا ہے۔ یقیناً ہماری طلب خام اور ظرف تنگ ہے۔

طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہمچناں در عملِ معدن و کان است کہ بود

توحید مسلمانوں کا طرۂ امتیاز اور ملت ابراہیمی اور دین حنیف کی سب سے بڑی خصوصیت تھی افسوس اب یہ امتیاز و خصوصیت ہم سے رخصت ہو گئی ہے اور کعبۃ اللہ کے ماننے والوں میں بھی مختلف راہوں سے کفر و شرک در آتا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کعبہ اور مرکز توحید پر پہنچ کر بھی محرومی اور بے توفیقی ہی ہمارے حصہ میں رہتی ہے ؎

اب تک ہوائے نجد جنوں خیز ہے مگر
مجنوں سا کوئی جوہر قابل نہیں رہا

غالباً قرآن مجید نے ہمیں جیسے لوگوں کی یہ تصویر کھینچی ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا
وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ وَمَا
يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا
وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ
(یوسف: ۱۰۵و۱۰۶)

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی
نشانیوں پر سے یہ لوگ گزرتے ہیں
درآنحالیکہ ان سے منہ موڑے ہوئے
ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ
پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ
ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے
ہوئے ہیں۔

اب توحید اور خدا پرستی کا دعویٰ زبانی رہ گیا ہے اور کاشانۂ دل میں طرح طرح کے بتوں کو بسا لیا گیا ہے علامہ اقبال مرحوم کے یہ اشعار بے اختیار زبان پر آرہے تھے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

حج توحید میں راسخ کرنے والی عبادت ہے لیکن کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی میں حاضری کے باوجود ہم جیسے مسلمانوں کا نکتۂ توحید سے ناآشنا رہنا عجیب بات ہے، جس کعبہ کی بنا و تاسیس کفر و شرک کے استیصال پر رکھی گئی ہو اگر وہاں بھی مشرکانہ اعمال و اشغال جاری رہیں اور جس نبیؐ کی دعوت کا نقطۂ آغاز توحید ہے اگر اس کے ماننے والے بھی توحید پر قائم نہ رہیں تو کجا ماند مسلمانی؟

زمانے کو پھر اسی مردِ حق بیں و حق آگاہ کی ضرورت ہے جو آذر کدۂ کفر و ضلالت
میں اذانِ حق اس قدر زور و شور سے بلند کرے کہ مشرق سے لیکر مغرب تک کا ہر ہر گوشہ
گونج اٹھے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے   صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ

یہ احساسات و خیالات برابر پیدا ہو کر سوہانِ روح اور خلش و اضطراب کا
باعث بنے رہے، اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے دعا کرتا رہا کہ وہ ہماری زندگی میں تبدیلی
لادے اور قلب ماہیت کر دے، توحید کا نور دل میں بھر دے، کفر و شرک کی آلائش
سے پاک کر دے، حیاتِ مستعار کے جو ایام رہ گئے ہیں وہ اس کی اطاعت، اعلائے کلمۃ اللہ
اور دینِ حق کی خدمت میں بسر ہوں، اللہ العالمین اپنے عاجز و ناتواں بندے کی یہ دعا
قبول کرے ع تجھے تیری قسم یارب فغانِ بے نوا سن لے

سلسلۂ سخن دراز ہو گیا، ہم عمرہ کے لیے گئے تھے، پہلے طواف کیا، ملتزم سے
لپٹنے کی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی بعد میں ایک روز یہ سعادت نصیب ہوئی
تھی، طواف کر چکے تو وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى مقام ابراہیمؑ کے
سامنے دو رکعت نماز ادا کی پھر فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ
بِهِمَا کے مطابق سعی بین الصفا والمروہ کی، طواف کے بعد کی دو رکعتوں کے بعد
سچے بڑی عاجزی اور الحاح سے دعائیں کیں، طواف و سعی کا سارا مرحلہ دعا و تضرع
اور گریہ وزاری میں بسر ہوا، اللہ کا بڑا کرم تھا کہ اس نے رجوع و انابت کی
کیفیت پیدا کر دی تھی، طواف و سعی کرتے ہوئے سب عاجزانہ دعائیں کرتے
اور آنکھوں سے اشک بہاتے رہے لیکن مولوی معین الدین سعی کرتے ہوئے

دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور سب سے کہتے تھے کہ ہم لوگوں کے لیے کیوں
نہیں دعا کرتے مولانا عبدالرؤف صاحب بڑے ضابط تھے مگر یہ فغانِ درد
سن کر ان سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔

طواف و سعی سے فارغ ہو کر ہم لوگ ایک مصری بال بر کی دوکان پہنچے
اور میں نے اور اکثر رفقا نے حلق کیا کیونکہ یہی افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے تین بار رحم اللہ المحلقین فرمایا تھا۔

اب گو ہم لوگ حلال ہو چکے تھے مگر ابھی تک جامۂ احرام میں ملبوس تھے،
مغرب اور عشا کی نماز حرم میں ادا کرنے کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس
آئے اور کھانا کھا کر سو گئے، صبح فجر کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد
میں نے غسل کیا اور احرام کے کپڑے اتار کر کرتا پائجامہ پہن لیا۔ اس روز ذی قعدہ
کی آخری تاریخ تھی۔ اس کے بعد سے ۸ ذی الحجہ تک ہم لوگ حلال رہے، ان
سات آٹھ دنوں میں اکثر دن رابطہ کی طرف سے ہم کو عصر بعد حرم لے جانے اور
عشا بعد وہاں سے ہماری قیام گاہ پر واپس لانے کے لیے گاڑی مہیا ہوتی تھی،
آخری چند دنوں میں شب میں ۳ بجے حرم شریف لے جانے اور طلوع آفتاب
کے بعد وہاں سے قیام گاہ کو واپس لانے کا اہتمام بھی رابطہ نے کیا تھا تاکہ لوگ
خانۂ کعبہ میں تہجد اور فجر کی نماز میں شریک ہو سکیں، لیکن اس سعادت سے کم لوگ
بہرہ اندوز ہو سکے۔ جمعہ کی نماز کا اہتمام گو ہماری قیام گاہ میں بھی کیا گیا تھا،
لیکن رابطہ کی طرف سے جمعہ کو ۱۱ بجے حرم شریف لے جانے کے لیے گاڑی موجود
رہتی تھی۔ ہم لوگوں نے ان سہولتوں سے فائدہ اٹھایا اور ان سات دنوں میں

چند بار طواف کی سعادت بھی حاصل کی۔

یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) سے پہلے جو موقع ملا، اس میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے ملاتے رہے جو مقاصد حج کے منافی نہیں ہے بلکہ حج کے اس عالمگیر اجتماع سے فائدہ اٹھا کر دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متعارف ہو کر ان کے حالات و مسائل سے واقفیت حاصل کرنا چاہیے، نسلی و خاندانی تفرقے اور ملکی و جغرافیائی تقسیم کو مٹا کر اور تباین رنگ و خوں کو چھوڑ کر ملت میں گم ہو جانا اور حرم کی پاسبانی اور مقاصدِ دین کو فروغ دینے کے لیے سب متحد ہو جائیں

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

میں اپنی کم آمیزی اور کم سخنی کی وجہ سے لوگوں سے ملنے جلنے اور گھل مل جانے کا زیادہ عادی نہیں ہوں، لیکن ہمارے بعض رفقائے سفر خصوصاً مولانا عبد المعونشا ملک اور باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی پیش پیش رہے اور اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا تاہم متعدد اشخاص سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کا موقع مجھے بھی میسر آتا رہا، بعض لوگ چونکہ نام سے واقف تھے اس لیے میرا شناختی کارڈ دیکھ کر خود لپک کر ملاقات کے لیے بڑھتے، افسوس ہے کہ اب ان سب لوگوں کے نام یاد نہیں آرہے ہیں کیونکہ نہ میں ان سے انکے کارڈ لے سکا اور نہ ان کے نام نوٹ کر سکا، پاکستان میں سرحد اور پشاور کے متعدد حضرات ملے اور ان کا لطف و کرم بھی مجھ پر رہا، پاکستان ہی کے مولانا عبد الرشید ربانی بھی ملے لیکن وہ لندن میں رہتے ہیں اور وہیں سے حج کے لیے آئے تھے اور وہیں واپس بھی گئے، بنگلہ دیش کے بھی کئی اصحاب علم سے ملاقات ہوئی، بنگلہ دیش

ہی کے مولوی محی الدین خاں بھی تھے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں وہ گو ہمارے کرے میں رہتے تھے لیکن ان کی آہ و فغاں کے مقامات اور بھی تھے، وہ مجھے ایک اچھی رقم اسلیے دینا چاہتے تھے کہ معارف کے گذشتہ جو شمارے موجود ہوں انہیں اور کچھ کتابیں بھجوا دوں، بابری مسجد خاص طور پر بھیجنے کی ہدایت کی، لیکن میں نے رقم لینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ آپ روپے کسی اور ذریعہ سے بھجوا دیں انشاء اللہ فرمائش کی تعمیل ہو جائے گی۔ بنگلہ دیش ہی کے ایک اور صاحب ملے جو سرکاری ملازم تھے اور جماعت اسلامی سے بھی غالباً قریب تر تھے، ان سے وہاں کی جماعت کے امیر صاحب کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی جو آج کل مورد عتاب ہیں، ان سے دو ایک بار اسلام کے احیاء و فروغ کے بارے میں لمبی گفتگو ہوئی، بعض اور حضرات سے بھی اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال ہوا، دراصل پاکستان، بنگلہ دیش اور دوسرے جن مسلم ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بعض دینی و اسلامی جماعتیں سرگرم عمل ہیں، اس کے سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ وہ سیرت و کردار سازی اور افراد و اشخاص کی تیاری جیسے بنیادی اور مقدم کام پر پوری توجہ نہیں دے رہی ہیں، اگر زمین تیار نہ ہو تو اس میں تخم ریزی سے کیا فائدہ؟ زمین کی تیاری سے پہلے جو بیج اس میں ڈالا جائے گا وہ سڑ گل جائے گا اور کسی طرح سینہ گیتی پھاڑ کر وہ نکل بھی آیا تو نہ تنومند ہو گا اور نہ برگ و بار لائے گا جس کے بعد یہ کہنا پڑیگا کہ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اگر کوئی غنچہ کھل بھی اٹھا تو دو دن سے زیادہ اپنی بہار نہیں دکھا سکے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ پہلے مسلمانوں کو "بار امانت" کے تحمل کا خوگر بنایا جائے، تزکیہ و تطہیر

کے عمل کی تکمیل کے بغیر اسلامی نظام کا قیام و نفاذ ممکن نہیں معلوم ہوتا اور اگر ہو بھی جائے تو بے نتیجہ اور بے فائدہ ہی ہوگا، اصل مقصود تو افراد و اشخاص کی تربیت و اصلاح ہے ۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس صدی کے اوائل میں ترکی ہی اسلامی خلافت کی یادگار رہ گیا تھا مگر اتحادیوں نے اس کے حصے بخرے کر کے اسے بالکل ہی بے دم کر دیا اور اب تک وہ انگریزوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے سنبھل نہیں سکا ہے، تاہم گزشتہ چند برسوں سے وہاں بھی بیداری کی لہریں اٹھ رہی ہیں اور حرمیت کی ہوائیں بھی چل رہی ہیں جس سے کچھ امید بندھی ہے، ترکی کے ایک صاحب ملے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اس صدی کے اوائل میں ہندوستان کے مسلمان ترکی اور خلافت کے نام پر مرمٹنے کے لیے تیار رہتے تھے اور اب بھی وہ ترکی پر اپنی جان چھڑکتے ہیں، یہ بتائیے کہ اسلام سے وہاں کے لوگوں کی دلچسپی کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ترکی کے عام باشندے تو اسلام کے شیدائی ہیں مگر حکمرانوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا ہے، میں نے ان کے خیال کی تائید کی اور عرض کیا کہ یہی حال دنیا کے ہر مسلم ملک کا ہے کہ عوام گو بہت کچھ محتاج تربیت ہیں تاہم وہ اسلام کا بول بالا چاہتے ہیں، مگر حکمراں طبقہ اسلام سے بیزار ہے، وہ اپنے استادانِ فرنگ کا پڑھایا ہوا سبق رٹ رہا ہے اور رسول ہاشمی کی غلامی پر فخر کرنے کے بجائے ساحرانِ افرنگ کا طوق غلامی اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہے، مسلم ممالک کی زبوں حالی کا باعث اس کے حکمراں ہی تو ہیں ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اس وقت مسلم ملکوں اور خصوصاً عرب ممالک میں قومیت و وطنیت اور رنگ و نسل کی لعنت نے قیامت برپا کر رکھی ہے آخر مسلمان فرنگی ساحروں کی اس سازش کا شکار کب تک رہیں گے، رسول ہاشمی نے تو ان فتنوں کا استیصال کر کے انہیں صرف اسلام اور توحید کے رنگ میں رنگا تھا صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

کشمیر کے کئی پر جوش نوجوان ملے جو شہر بدر کر دیے گئے ہیں اور دوسرے ملکوں میں رہ کر کشمیر کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ہم لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور انڈین یونین کے اندر رہ کر اپنے حقوق حاصل کرنے پر زور دیا تو ایک نوجوان نے کہا کہ ہمارا مسلسل استحصال کیا جا رہا ہے، آپ لوگ تصور نہیں کر سکتے کہ ہم پر کتنے مظالم ہو رہے ہیں، نوجوان نے کہا کہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان سے کٹ گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا گزرے گی؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ابھی تک تو کشمیر ہندوستان کا انگ ہے مگر اس کے باوجود یہاں کے مسلمانوں کی حالت کون سی بہتر ہے، حکومتِ ہند نے فرقہ پرستوں کو کھلی آزادی دے رکھی ہے اور وہ مسلمانوں کو ہر طرح سے زدوکوب کر رہے ہیں اب تو مختلف صوبوں میں ایسی پارٹیاں برسر اقتدار آگئی ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی یادگاروں اور عبادت گاہوں کو مسمار کر دینا چاہتی ہیں، کشمیر کے الگ ہو جانے پر اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ گو کشمیریوں کی باتوں میں بڑا جوش تھا مگر ہندوستان کی حکومت کو ان کے مسائل اور حالات سے واقف ہو کر

انہیں حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے، کشمیر کے غلام نبی فئی واشنگٹن سے آئے تھے،
انھوں نے معارف کی خریداری کے لیے ۲۴ ڈالر دیئے۔

افغانستان کے مجاہدین سے بھی ملاقات ہوتی تھی ان میں واقعی اسلامی جوش
وحمیت تھی اور انھوں نے اس دور میں بدر وحنین کی یاد تازہ کردی ہے عرب تو
اسرائیل جیسے چھوٹے ملک کے ہاتھوں ذلت ورسوائی کا سامنا کر رہے ہیں، مگر
افغانوں نے روس جیسی سپر پاور کے چھکے چھڑا دیے اب ساحران افرنگ کی سازش
وہاں بھی کامیاب دکھائی دیتی ہے اور مجاہدین اس وقت آپس میں گتھم گتھا ہوگئے ہیں۔

ماریشس سے گل حمید بگن صاحب تشریف لائے تھے جو وزارت تعلیمات کے
تحت مشرقی زبانوں کے سینیر انسپکٹر اور اردو سکشن کے ہیڈ تھے۔ وہ وہاں کی عربی
اردو اکیڈمی کے صدر اور مشہور صحافی بھی تھے، ان سے برابر ملاقات رہتی انہی کی
زیر نگرانی گزشتہ سال ماریشس میں ایک بڑی اردو کانفرنس ہوئی تھی جس میں ہندوستان
سے بھی بہت سارے لوگ شریک ہوئے تھے جس کی مفصل کارروائی ہماری زبان
میں چھپ چکی ہے، میں نے جب ان کو بتایا کہ کانفرنس کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا
مگر میں اس میں شریک نہیں ہوسکا تو ان کو بڑا افسوس ہوا، انھوں نے کہا کہ اب
اگر کوئی پروگرام ہوا تو پکا وعدہ کریں کہ اس میں ضرور شریک ہوں گے۔

مولانا عبدالرؤف ملک صاحب نے بھی کئی بار لاہور آنے کی دعوت دی، وہ
متحدہ علما کونسل پاکستان کے سکریٹری ہیں، جو ابھی نوتشکیل ہے، مولانا نے اسکے
اغراض ومقاصد اور قواعد وضوابط کا مسودہ مجھے بھی دیکھنے اور اظہار خیال کیلئے
عنایت کیا تھا، وہ اسی سال کونسل کا سہ روزہ اجلاس کرنا چاہتے تھے جس میں

ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے بھی شریک ہونا منظور کر لیا ہے، انہی کے مشورے
سے اجلاس کی تاریخوں کا تعین ہوگا۔ ملک صاحب نے ازراہ کرم مجھکو بھی اس میں
شرکت کی دعوت دی اور اس کا دعوت نامہ بھی بھیجنے کا وعدہ کیا ہے مگر انکی
خواہش تھی کہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کو بھی اس میں شرکت
کے لیے آمادہ کردوں، میں نے عرض کیا کہ ع غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم انکو

لیکن حضرت مولانا اس کو منظور بھی فرمالیں گے اس کا اجازہ نہیں کرتے،
۱۱ اگست کو میں حضرت مولانا سے ملنے لکھنؤ حاضر ہوا تو خیال تھا کہ مولانا عبدالرؤف
صاحب کا پیغام بھی ان کو پہونچاؤں گا مگر مولانا میرے پہنچنے کے دو تین گھنٹہ بعد
وزیر اعظم کی دعوت پر ان سے بابری مسجد کے مسئلہ پر گفتگو کے لیے دہلی تشریف
لے جانے والے تھے اس لیے متحدہ علما کونسل کے اجلاس کے بارہ میں ان سے کوئی
گفتگو نہیں ہوئی۔

مالے کے ایک بزرگ عالم جن کا نام اب یاد نہیں رہا عین حج کے موقع
پر ہمارے ہی کمرہ میں آکر قیام پذیر ہوگئے تھے ان سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات
چیت ہوتی تھی، انھوں نے بتایا کہ مالے اور اس کے قرب وجوار کے ملکوں کے
اکثر لوگ مالکی ہیں اور وہ خود بھی مالکی ہیں، نائیجیریا، ایتھوپیا وغیرہ کے
متعدد حضرات بھی رابطہ کے مہمان تھے، ان میں سے بعض لوگ فرض نمازوں کے بعد
عربی اور انگریزی میں تقریریں بھی کرتے تھے۔

ترکی اور انڈونیشیا سے بکثرت لوگ آئے تھے، انڈونیشیا کے ایک صاحب
سے اکثر کھانے کی میز پر گفتگو ہوتی، وہ مجھ سے ہندوستان کے مسلمانوں کے

بارے میں اور میں ان سے انڈونیشیا، جاوا اور سماترا وغیرہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں سوالات کرتا تھا، چین سے آئے ہوئے چند لوگوں سے بھی کسی قدر انسیت پیدا ہوگئی تھی، یہ لوگ بڑی گرم جوشی اور خندہ روئی سے ملتے۔ اکثر ملکوں کے لوگ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں فرقہ پرست جماعتوں کے جارحانہ رویے کے بارے میں سوالات کرتے، خصوصاً بابری مسجد کے متعلق بڑی تشویش و اضطراب کا اظہار کرتے۔

یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رابطہ کی دعوت پر جن ملکوں کے لوگ تشریف لائے تھے ان میں سے اکثر عربی سے تو واقف تھے ہی، وہ اردو کو بھی سمجھ لیتے تھے، وہی اردو جو اپنے وطن میں غریب الوطن ہوگئی ہے لیکن اس کی آواز کہاں کہاں پہنچ گئی ہے، مکہ و مدینہ کی دوکانوں پر بعض بعض عرب بھی اردو بول اور سمجھ لیتے تھے ع

تری آواز مکے اور مدینے

اردو کا یہ حال دیکھ کر خیال ہو رہا تھا کہ اس کو مٹانا آسان نہیں ہے، اگر ہندوستان میں اس کے لیے دروازے بند کیے جارہے ہیں تو دوسرے ملک اس کے لیے اپنی آغوش واکئے ہوئے ہیں، اس صورت میں اردو کہہ سکتی ہے ؎

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم　　مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

لیکن یہ اس ملک کی بدبختی ہوگی کہ وہ اردو کو کھو کر اپنا ایک بیش قیمت سرمایہ کھو دے گا ع اضاعونی وای فتی اضاعوا

انھی ایام میں ایک روز ہم لوگ بنگلہ دیش کے مولانا محی الدین خاں صاحب کے ہمراہ جو رابطہ عالم اسلامی کے ممبر ہیں رابطہ کے دفتر مکہ معظمہ گئے وہ ہمیں دفتر کی

چوتھی بالائی منزل پر لے گئے اور سب سے پہلے رابطہ کے انگریزی مجلہ (Mus World League Journal) کے اڈیٹر محمد عبدالقادر صاحب کے پاس لے گئے، انھوں نے ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب سے ایک انٹرویو لیا، ان کے ساتھ ہی لاہور اور نالندہ بہار کے دو صاحبان بھی کام کرتے تھے، ان دونوں سے بھی ملاقات کی گئی پھر ہم لوگ عربی اخبار الندوہ کے اڈیٹر نور الاسلام صاحب سے ملے انھوں نے ہم سب سے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیا، مجھ سے دارالمصنفین اور رسالہ معارف کے اغراض و مقاصد اور گزشتہ خدمات اور اسلام کی دعوت و اشاعت میں دارالمصنفین کے حصے کے بارے میں سوالات کیے تھے جس کا جواب میں نے یہ دیا تھا:

"۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ناکامی کے بعد ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر انگریزوں کے مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، انھوں نے ان کو سیاسی، معاشی، تہذیبی اور اجتماعی حیثیت ہی سے بالکل مجبور اور بے بس نہیں کر دیا تھا بلکہ اسلام، قرآن مجید، رسول عربی اور اسلامی تاریخ و تہذیب غرض ہر چیز پر طرح طرح کے اعتراضات کر رہے تھے، ان کی مدافعت و مقابلہ اور مسلمانوں کی ہمت و حوصلہ بڑھانے کے لیے اس وقت جو اصحاب علم آگے بڑھے تھے ان سب میں علامہ شبلی اس کام کے زیادہ اہل تھے کیونکہ وہ زمانہ کے حالات اور تقاضوں سے بھی باخبر تھے اور مذہبی علوم سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو اپنے ماضی سے وابستہ ہونے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر و قیمت پہچاننے کی دعوت دی اور دوسری طرف مستشرقین اور یورپ کے فضلاء کے

ایک ایک اعتراض کا تار و پود بکھیر دیا۔ ان کی تصنیفات کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت محققانہ اور دلنشین انداز اور عصری زبان و اسلوب میں لکھی گئی تھیں۔

اسلام کی عظمت و شوکت کو نمایاں کرنے اور مستشرقین و معترضین اسلام کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں دارالمصنفین کا مبارک خیال ڈالا تھا مگر ابھی یہ ابتدائی مرحلہ ہی میں تھا کہ ان کا وقتِ آخر آپہونچا اس لیے انکے شاگردوں کی جماعت آگے بڑھی اور اس نے علامہ کے ناتمام کاموں کی تکمیل کیلئے اپنی زندگی وقف کردی، اس جماعت کے سرخیل مولانا سید سلیمان ندویؒ نے دارالمصنفین کو بامِ عروج پر پہونچا دیا۔ ان کی مساعی جمیلہ سے اصحاب علم و قلم کی ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جو ہر قسم کی دنیاوی طمع سے بے نیاز ہو کر شب و روز صرف علم و مذہب کی خدمت میں مشغول رہتی تھی، دارالمصنفین کے بنیادی اور اہم مقاصد یہ تھے۔

۱۔ اسلام، اسلامی علوم و فنون، اسلامی تہذیب و تمدن اور تاریخ کے متعلق اردو زبان میں محققانہ کتابوں کی تالیف و ترجمہ اور انکی طبع و اشاعت کا سامان کرنا۔

۲۔ قوم کی ذہنی و دماغی تربیت کے لیے مصنفین اور اہل قلم کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو عصری تقاضوں کے مطابق جدید اسلوب میں اسلام کی خدمت و اشاعت کا کام انجام دے۔

۳۔ اسلام، اسلامی علوم و تہذیب و تمدن اور تاریخ و ادب کے بارے میں مستشرقین اور دوسرے مورخین و مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کا ازالہ۔

دارالمصنفین ۱۹۱۴ء میں قائم ہوا تھا، اس وقت سے اب تک اس نے تقریباً ۲۰۰ کتابیں شایع کی ہیں جن میں بعض عربی اور انگریزی کی بھی ہیں، اس کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔

.. .. [1]

علامہ شبلیؒ کے پیش نظر معارف کے نام سے ایک علمی، دینی اور تحقیقی رسالہ کا اجرا بھی تھا، انھوں نے اس کے اغراض و مقاصد کا خاکہ بھی تیار کر لیا تھا مگر یہ ان کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۱۶ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ادارت میں نکلا اور الحمد للہ اس وقت سے اب تک مسلسل بلاناغہ شایع ہو رہا ہے۔

ناموافق حالات کے باوجود اب بھی دارالمصنفین اپنے مقاصد کی تکمیل میں لگا ہوا ہے اور اس کے کارکن ایثار و قناعت کے ساتھ بہت قلیل مشاہرہ پر یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

دارالمصنفین کا نظم و نسق چلانے کے لیے دو مجلسیں ہیں، ایک مجلس انتظامیہ جس میں ہندوستان کے ہر خطہ کے ممتاز اصحاب علم و فضل اور سربرآوردہ افراد شامل ہیں اور اس کی سربراہی نواب مغتنم جاہ بہادر کر رہے ہیں، اسی مجلس انتظامیہ سے ایک مجلس عاملہ تشکیل کی گئی ہے جو دارالمصنفین کے عام نظم و نسق کی نگرانی کرتی ہے اس کے سربراہ دنیائے اسلام کے مشہور عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

نورالاسلام صاحب نے آخری سوال یہ کیا تھا کہ قبۂ صخرہ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر بن الخطاب کی تعمیر اور ترمیم و اصلاح کے لیے خادم حرمین شریفین ملک فہد بن عبدالعزیز

---

[1] طوالت کی وجہ سے کتابوں کے نام چھوڑ دیے گئے ہیں۔

کی تجویز کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں"؟ میں نے عرض کیا کہ "یہ ایک مناسب، مبارک اور بروقت اقدام ہے جس کی تائید دنیا بھر کے مسلمانوں کو کرنی چاہیے" میں حج کے اچھے اور معقول انتظام کے لیے بھی خادم حرمین شریفین اور ان کی حکومت کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور رابطہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اور دوسرے ذمہ داروں کا بہت شکر گذار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ مجھ کو حج و عمرہ کی سعادت نصیب کی۔

نورالاسلام صاحب سے مل کر میں ادارہ قرآن کریم کے دفتر گیا اور اسکے باحث سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ملا، یہ پاکستان کے رہنے والے اور دارالمصنفین کے نام اور اس کے کام سے بھی کسی حد تک واقف ہیں، میں نے ان سے عرض کیا کہ رابطہ سے شایع ہونے والا لٹریچر دارالمصنفین کے کتب خانہ کو بھجوانے کا نظم کرادیں اور اگر ممکن ہو تو عرب ملکوں میں شایع ہونے والی کتابیں بھی بقیمت یا بلاقیمت بھجوادیں تو انھوں نے فرمایا کہ اگر کتابیں ہم کو مل جائیں تو ان کو بھجوانے کی ذمہ داری ہماری ہوگی۔ میں نے اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا، یک بیک ان کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ اٹھ گئے اور کہنے لگے کہ ظہر کی جماعت کا وقت ہوگیا ہے پھر وہ مسجد چلے گئے ہم لوگوں کو وضو کرنا تھا اس لیے نورالاسلام صاحب کے دفتر میں انکی اقتدا میں نماز ادا کرکے اپنی قیام گاہ واپس آگئے۔

عنایت اللہ صاحب سے ایام حج میں رابطہ کے مہمان خانہ میں بھی دو تین بار ملاقات ہوئی، حج کے بعد ایک روز پھر رابطہ کے دفتر گیا مگر عیدالاضحیٰ کی تعطیل کی وجہ سے ان سے اور دوسرے حضرات سے ملاقات نہیں ہوئی۔ (باقی)

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۹۲-۸-۱۷ء

مکرمی و معظمی جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔ معارف کا جولائی کا شمارہ پرسوں ملا، مضمون اور خط کی اشاعت پر شکر گذار ہوں۔ مصر قدیم کا نام غلط چھپ گیا ہے (ص ۵۶) صحیح نام منف (مَ نَ فْ)، یا منفش (مَ نُ فَ شْ) ہے۔

معارف کے شذرات میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ سو فیصد حقیقت پسندانہ اور جرأتمندانہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

بوسنیا میں اسپین کی تاریخ دہرائی جارہی ہے، مسلمانوں پر مظالم کا حال پڑھکر کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ان دنوں میری زبان پر قرآن پاک کی یہ آیت بار بار آتی ہے لَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ، دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان جب تک مسلمان ہیں ہلال اور صلیب کی آمیزش ہمیشہ جاری رہے گی اور مسلمانوں اور یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان کشمکش تاقیامت قائم رہے گی۔

افسوس ہے کہ بوسنیا کی قریبی مسلمان حکومتیں، یعنی ترکیہ اور البانیہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہیں، عربوں کو باستثنائے چند عرب قومیت کا بخار چڑھا ہوا ہے اور وہ غیر عرب مسلم ممالک میں چنداں دلچسپی نہیں لیتیں، پاکستان نے بقدر ہمت اور استطاعت بوسنیا کی مالی امداد کی ہے، ہاں جون کا شمارہ ابھی تک نہیں ملا، اس کی ایک کاپی ضرور بھجوادیں، امید ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے خطوط جلد چھپ جائیں گے۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ رفقائے کرام سلام قبول فرمائیں۔

نیازمند شیخ نذیر حسین

وفیات

پروفیسر مسعود حسن

از پروفیسر مختار الدین احمد

علمی و ادبی دنیا میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۷ مئی ۹۲ء کی شب کو عربی و فارسی کے مشہور استاد اور اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر مسعود حسن طویل علالت کے بعد کلکتہ میں وفات پا گئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

مسعود حسن ۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو اپنے وطن کھگول (دانا پور) ضلع پٹنہ کے ایک ممتاز اہلحدیث خاندان میں پیدا ہوئے جو وہاں کئی پشتوں سے آباد تھا اور اپنے مذہبی اور علمی خدمات کی وجہ سے مشہور تھا۔ ان کے والد منشی غلام قادر نے انہیں ان کے حقیقی ماموں حکیم مولانا محمد حسن[1] (۱۸۸۰۔۱۹۶۱ء) کے سپرد کر دیا جن کے سایۂ عاطفت میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، متوسطات کی تعلیم مدرسۂ فیض عام مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ میں پاکر وہ ۱۹۳۲ء میں مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخل ہوئے جہاں مدرسہ اکزامنیشن بورڈ سے ۳۳ء میں انھوں نے "مولوی" اور ۳۵ء میں "عالم" کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ انکے وہاں کے اساتذہ میں مولانا محمد سہول عثمانی، مولانا اصغر حسین بہاری، مولانا سید دیانت حسین دربھنگوی، مولانا ظفر الدین قادری (۱۸۸۵۔۱۹۶۲)، مولانا سید شاہ عبید اللہ المجہری (متوفی ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۰ھ) مولانا عبد الشکور آہ مظفرپوری اور مولانا سید عبد السبحان دسنوی کے نام یاد آتے ہیں۔ مولانا محمد سہول، مولانا اصغر حسین اور مولانا عبد الشکور مدرسۂ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد، مولانا دیانت حسین نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ معقولات میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی کے اہم تلامذہ میں تھے۔ مولانا ظفر الدین قادری، مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے شاگرد تھے وہ مدرسۂ منظر اسلام بریلی کے فارغ التحصیل اور مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ (۱۲۷۲۔۱۳۴۰ھ) کے تلمیذ خاص اور ان کے مجاز و خلیفہ تھے، مولانا شاہ عبید اللہ نے المجہر اور دوسرے مقامات کے علماء سے علمی فیوض حاصل کیے تھے۔ جب کہ مولانا سید عبد السبحان ندوۃ العلما کے تعلیم یافتہ تھے۔ مسعود حسن ایک دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اس لیے ان کی علمی استعداد مضبوط تھی۔ عربی ادب سے ان کی خاص دلچسپی تھی۔ عربی لکھنے پر قدرت رکھتے تھے، ان کی شرح دیوان حماسہ دہلی سے شایع ہوئی تھی اور بہار کے دینی مدارس میں مروج تھی۔ مقامات حریری کے دس مقامات انہیں حفظ تھے اور اس کے فقرات و تراکیب اپنی عربی تحریر میں خوبصورتی سے استعمال کرتے تھے۔ اس لیے مولانا عبد السبحان جو عربی ادب پڑھاتے تھے ان پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے۔

مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے دوستوں میں عبد الاحد شرف الدین پوری (جو بعد کو طبیہ کالج پٹنہ میں پروفیسر اور اس کے پرنسپل ہوئے) حفیظ الرحمٰن اوج شمسی (جو تعلیم سے فراغت کے بعد اسی مدرسے میں استاد، پھر اس کے پرنسپل مقرر

---

[1] حکیم صاحب، مولانا محمد ابراہیم آروی (متوفی ۱۳۲۰ھ) مؤسس مدرسۂ احمدیہ آرا (ضلع شاہ آباد) اور مشہور محدث مولانا حافظ عبد اللہ غازیپوری (متوفی ۱۳۳۷ھ) کے تلامذۂ خاص میں تھے۔

ہوئے)، عبدالقیوم تہجور شمسی سہرامی (۱۹۱۵-۱۹۷۴) اور حافظ ظہیر احمد مجروح عظیم آبادی
مرحوم کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔ میں ان سے عمر میں چھوٹا تھا لیکن مجھ سے اس زمانے
میں بھی ان کا برتاؤ دوستانہ رہا اور بعد کو جو ان سے گہرے تعلقات قائم ہوئے وہ
ہمیشہ استوار رہے۔

وہ مدرسے کی تعلیم کے بعد ۳۶ء میں اپنے بھائی ڈاکٹر محمود حسن کے پاس کلکتہ
چلے گئے جو بعد کو وہاں کے ایک طبی ماہر اور سماجی کارکن کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔
ان کی وفات کلکتہ ہی میں ۲ر نومبر ۶۷ء کو ہوئی۔ مسعود حسن نے ان کے زیر سایہ
رہ کر انگریزی کی تعلیم مکمل کی۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۴۳ء میں عربی میں
اور بعد کو فارسی میں بھی ایم اے کیا۔ دونوں امتحانات میں وہ فرسٹ ڈویژن میں
کامیاب ہوئے ان کے اساتذہ میں پروفیسر محمد زبیر صدیقی (المتوفی ۱۸ر مارچ ۱۹۷۶ء)،
پروفیسر محمد محفوظ الحق (ولادت ۲ر جنوری ۱۹۰۰ء وفات ۱۰ر جون ۴۶ء)، پروفیسر
محمد اسحٰق (متوفی ۱۲ر ستمبر ۶۹ء)، مولانا فضل الرحمٰن باقی اور مولانا محمد اکبر ندوی
(۱۵ر رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ م) تھے۔ ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر محمد اسحٰق کے طبائع میں
بڑا فرق تھا اور ان کا طریقۂ کار بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف، لیکن مسعود حسن
کے تعلقات دونوں سے ہمیشہ استوار رہے، وہ اپنے اساتذہ میں مولانا فضل الرحمٰن
باقی (۱۸۹۷-۱۹۶۳) کے تبحر علمی کے خاص طور پر قائل تھے اور ان کے اخلاق حمیدہ
سے بہت متاثر۔ وہ ابن ربن الطبری (۱۶۵ ؟ - قبل از ۲۴۶ھ) کی فردوس الحکمۃ
(برلن ۱۹۲۸) مرتبہ پروفیسر محمد زبیر صدیقی پر ان کے تنقیدی مضمون کو تحقیق و تنقید کا
بہت اچھا نمونہ سمجھتے تھے جو مولوی عبداللہ دہلوی کے فرضی نام سے مولانا عبدالرزاق

ملیح آبادی کے اخبار ہند کلکتہ میں کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا۔

انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز پٹنہ کالج سے کیا جہاں وہ ۱۹۴۶-۱۹۴۷ میں
عربی کے لکچرر رہے۔ یہ عارضی جگہ غالباً وہاں کے لکچرر حافظ عبدالقدوس کے تحقیقی کاموں
کے لیے انگلستان چلے جانے پر خالی ہوئی تھی۔ وہ ایک سال کے بعد ہی واپس آگئے
تو مسعود حسن کلکتہ واپس چلے گئے، ۴۸ء میں ان کا تقرر عربی، فارسی اور اردو کے
لکچرر کی حیثیت سے ہوگلی محسن کالج ہوگلی میں ہوگیا، جہاں وہ ۵۲ء تک ان شعبوں
کے صدر رہے۔ اسی سال وہ سنٹرل کلکتہ کالج کلکتہ میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ
پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۵۹ء میں وہ کلکتہ مدرسہ (سابق مدرسۂ عالیہ) کے پرنسپل
بن کر آئے اور ۴ر جنوری ۶۴ء کو کوئی چھ سال کے بعد مدرسے سے سبکدوشی کے
بعد وہ مولانا آزاد کالج کلکتہ میں اپنی سابقہ ملازمت پر واپس آگئے۔ یہاں وہ عربی
فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ وہ ۶۷ء میں پروفیسر مقرر ہوگئے، جہاں وہ
دس سال تک عربی و فارسی کے صدر رہے۔ ۷۷ء میں ان کی خدمات پبلک سروس
کمیشن مغربی بنگال نے حاصل کر لی، وہ پانچ سال تک کمیشن میں اپنے فرائض بحسن وخوبی
انجام دے کر ۸۲ء میں متقاعد ہوئے۔ وہ تقریباً بیس سال تک کلکتہ یونیورسٹی
میں عربی و فارسی کے جز وقتی لکچرر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

مسعود حسن کے علمی و ادبی ذوق کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ کم عمری ہی
میں جب وہ مدرسے کے طالب علم تھے ان کے افسانے، دوسری ادبی تحریریں اور
عربی سے ترجمے 'مسعود حسن دانا پوری' کے نام سے ادبی دنیا، ہمایوں، ساقی اور موقر
ادبی رسالوں میں شایع ہوتے تھے، جب وہ کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے کے

طالب علم تھے انھوں نے اپنا ایک مضمون علامہ سید سلیمان ندویؒ کو معارف میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ یہ جولائی ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا، پھر معارف میں ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے۔ پروفیسر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی) (مئی ۷۶ء) مولانا محمد اکبر ندوی (معارف ستمبر ۸۰ء) اور مولانا ابو سلمہ شفیع احمد (معارف مارچ ۸۶ء) کی رحلت پر ان کے جو مضامین "وفیات" کے عنوان کے تحت چھپے وہ اکثر قارئین معارف کو یاد ہوں گے۔

اردو کے مشہور انشا پرداز ل۔ احمد (لطیف الدین احمد ۱۸۸۵ - ۱۹۸۰) اکبرآبادی مقیم کلکتہ سے ان کے گہرے تعلقات تھے، وہاں کی انجمن "سخن زار" نے جشن ل۔ احمد منانے کا منصوبہ بنایا تو مسعود حسن جو انجمن اور جشن کمیٹی کے اہم رکن تھے۔ وہ ان مضامین کو ایک مجموعے کی شکل میں شایع کرنا چاہتے تھے۔ کلکتہ میں اس کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا تو انھوں نے اس مجموعے کے لیے جو مضامین لکھوائے تھے وہ مالک رام صاحب کو بھیج دیے جو اس زمانے میں ل۔ احمد پر رسالہ تحریر (ادبی مجلس دہلی) کا ایک خصوصی نمبر شایع کر رہے تھے۔ یہ مضامین تحریر جلد ۸ - ۳ (جولائی ۸۲ء) میں شایع ہوئے، جس میں ان کا بھی ایک مضمون شریک اشاعت ہے۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ سخن شعرا کے مصنف عبد الغفور نساخ (۱۸۳۴ - ۱۸۸۹) کی خود نوشت سوانحیات (نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) مرتب کر رہے ہیں اور اس پر مفصل مضمون بھی لکھ رہے ہیں۔

۴۲ء سے انھوں نے مضمون نگاری شروع کی، اگر ان کی علالت کے آخری پانچ سال نکال بھی دیے جائیں تو پچاس پچپن سال میں انھوں نے جو کچھ لکھا انہیں جمع

کیا جائے تو یہ تحریریات دو تین جلدوں میں آئیں گی۔ ضرورت ہے کہ ان مضامین کا انتخاب مرتب کر کے شایع کر دیا جائے۔ ان کے احباب و تلامذہ اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔

مسعود حسن اردو نثر تو اچھی لکھتے ہی تھے، انہیں انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اسلامک کلچر (حیدرآباد) جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال انڈو ایرانیکا (کلکتہ) انڈین لٹریچر (ساہتیہ اکیڈمی دہلی) السٹریٹیڈ ویکلی (بمبئی)، اسٹیٹسمین (کلکتہ) وغیرہ میں شایع شدہ مضامین اس کے گواہ ہیں۔

پھلواری شریف (پٹنہ) کے ایک قدیم فارسی گو شاعر شاہ ابو الحسن فرد (ولادت ۱۰ رجب ۱۱۹۴ھ وفات ۲۴ محرم ۱۲۶۵ھ) کے ضخیم دیوان کا مطالعہ کر کے انھوں نے ایک تفصیلی مضمون انگریزی میں لکھ کر انڈو۔ ایرانیکا جلد ۸ شمارہ ۲ (۱۹۵۵ء) کلکتہ میں شایع کرایا تھا۔ یہ کتابچے کی شکل میں سوسائٹی سے اب بھی ملتا ہے۔ عباسی شہزادی عُلیّہ بنت المہدی (۱۶۰ - ۲۱۰ھ) کی زندگی اور شاعری پر ان کا مضمون اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپا جس میں انھوں نے مختلف قدیم مصادر سے اس کے اشعار بھی تلاش کر کے جمع کر دیے ہیں۔ ابن حزم اور اس کی جمہرۃ الانساب پر ان کا مقالہ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (جلد ۱۲ : ۱) میں ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا۔ انڈو۔ ایرانیکا میں بھی ان کے کچھ مضامین چھپے ہیں لیکن وہ شمارے اس وقت پیش نظر نہیں۔ میرزا انیس پر ان کا ایک بہت اچھا مضمون خوشونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کے دور ادارت میں السٹریٹیڈ ویکلی (بمبئی) میں چھپا تھا۔ جسے انیس کے قدردانوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے انگریزی رسالے

انڈین لٹریچر میں ل۔ احمد پر ان کا مقالہ شایع ہوا تھا۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ہندوستانی ادب کے معمار سیریز" کے لیے انگریزی میں ل۔ احمد پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ انھوں نے جناب مالک رام صاحب سے جو اس وقت اکیڈمی کے جنرل کونسل کے ممبر اور اردو سیکشن کے سکریٹری تھے، دہلی جا کر اس کی اشاعت کے سلسلے میں بات بھی کر لی تھی۔

عربی و اسلامیات سے ان کی دلچسپی گہری تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ عہد عباسی کے غزل گو شاعر عباس بن الاحنف (متوفی ۱۹۲ھ) پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ دیوان العباس بن الاحنف کا ایک پرانا اڈیشن مطبع الجوائب، قسطنطنیہ کا ۱۲۹۸ھ کا چھپا ہوا ان کے پیش نظر تھا، میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اپنے کام کی بنیاد اس جدید علمی اڈیشن پر رکھیے جسے ڈاکٹر عاتکہ الخزرجی نے متعدد نسخوں سے مرتب کر کے قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں شایع کیا ہے۔

ابن حزم اندلسی (۳۸۴-۴۵۶ھ) ان کے محبوب مصنفوں میں تھے مراتب الاجماع کا ایک قلمی نسخہ ان کے ذخیرۂ کتب میں تھا، کتبخانۂ خدابخش کے نسخے کی مدد سے انھوں نے اس کا متن مرتب کرنا شروع کیا اور اس پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا، جس کا اختصار راقم الحروف نے اپنے دور ادارت میں علی گڑھ کے مجلہ علوم اسلامیہ جلد ۱: ۲ (دسمبر ۱۹۶۰) میں شایع کیا۔ کچھ اضافوں کے بعد یہ مقالہ انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی اسلامک اسٹڈیز کی کانفرنس میں پیش کیا۔ انھوں نے مراتب الاجماع کے مرتب کردہ متن سے حمد و نعت اور کتاب الطہارۃ کے ابتدائی حصے کا متن بھی مجلہ علوم اسلامیہ میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا، میں نے انہیں لکھا کہ

یہ کتاب مکتبۂ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ میں شایع ہوئی ہے اسے بھی پیش نظر رکھیے اور مکمل کتاب ایک ساتھ شایع کیجیے۔

ابن حزم کی دوسری کتاب جس کی ترتیب و تصحیح کی فکر میں وہ برسوں رہے، جمہرۃ انساب العرب ہے، اس کا بہت اچھا نسخہ کتب خانۂ خدابخش میں محفوظ ہے۔ جب وہ پٹنہ کالج میں عربی کے لکچرر تھے، ان کی نگاہ سے یہ نسخہ گزرا اور مصنّف و مصنَّف سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ جب وہ کچھ دنوں کے بعد کلکتہ واپس گئے تو انھوں نے عزم کر لیا کہ وہ اس نادر مخطوطے کو، جو اب تک شایع نہیں ہوا تھا، پروفیسر محمد زبیر صدیقی (صدر شعبۂ عربی و فارسی و اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی) کی نگرانی میں اڈٹ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کریں گے۔ انہیں خدا بخش اور ذخیرۂ شاہ احسان اللہ سندھی کے نسخوں کا علم تھا۔ انھوں نے استاذ مرحوم علامہ عبدالعزیز المیمنیؒ سے جمہرہ کے دوسرے نسخوں کے بارے میں اطلاعات طلب کیں۔ انھوں نے اطلاع دی کہ اس کے نسخے قاہرہ، استانبول وغیرہ میں ہیں، ایک نسخہ جو شاہ احسان اللہ سندھی کے ذخیرے میں سندھ میں محفوظ ہے۔ بہت بعد کا مکتوبہ ہے اور اس کی اہمیت نہیں، لیکن نُسَخ خدابخش و رامپور جو علی الترتیب ۹ ویں اور ۱۰ ویں صدی ہجری کے لکھے ہوئے ہیں بہت اچھے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ فی الحال ان دو نسخوں کی بنیاد پر کام کر کے ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کر دیجیے، اس عرصے میں مصر و ترکی کے نسخوں کی مائکرو فلم یا عکس حاصل کیجیے اور اشاعت کے وقت ان سے مدد لیجیے، آپ ان کے حصول کے انتظار میں ابھی سے رہے تو کام میں تعویق ہوگی۔ وہ میرے مشورے پر عمل

نہ کر سکے اور اگر کام انھوں نے کچھ کیا تھا تو اسے اتمام تک نہ پہنچا سکے۔

اس سے پہلے استاذ مرحوم کی نگرانی میں علی گڑھ کے ایک ریسرچ اسکالر مزمل جمہرۃ انساب العرب کو بانکی پور، رام پور اور استانبول کے نسخوں کی مدد سے مرتب کر رہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ تکمیل سے پہلے وہ وفات پا گئے۔ ۱۹۳۶ میں جرمن مستشرق اوٹو اشپیز جو یہاں شعبۂ عربی میں دو سال (۱۹۳۲ - ۱۹۳۴) بہ حیثیت استاد مامور رہے تھے جاتے وقت مزمل حسین مرحوم کا مرتب کردہ متن اور مصورہ استانبول اپنے ساتھ بغرض اشاعت جرمنی لیتے گئے، وہ شاید جرمن اورینٹل سوسائٹی سے اسے شایع کرانا چاہتے ہوں گے، جہاں سے بیسیوں قدیم عربی مخطوطات شایع ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں، لیکن کسی وجہ سے یہ کتاب شایع نہ ہو سکی۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں جب پروفیسر اشپیز سے میں بون یونیورسٹی میں ملا تو وہ عدم اشاعت کی کوئی وجہ بتانے سے قاصر رہے، بیس سال پہلے کی بات انہیں اچھی طرح یاد بھی نہ تھی۔ مزمل حسین کا مرتب کردہ نسخہ میں نے ان کے شعبے میں تلاش کیا، موجود نہ تھا، میرا خیال ہے انھوں نے جرمن اورینٹل سوسائٹی کو ماینتز (مغربی جرمنی) بھیج دیا ہوگا جہاں ان دنوں اس کا دفتر تھا، وہاں کسی وجہ سے یہ کتاب شایع نہ ہو سکی۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰ - ۱۹۴۹) سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی اور علامہ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف السورتی (۱۸۸۹ - ۱۹۴۳) بھی کسی زمانے میں جمہرہ کی اشاعت کی فکر میں تھے۔ مولانا سورتی نے تو نسخۂ امپور کی نقل تیار کرا کے کتب خانہ خدا بخش کے نسخے سے اس کا مقابلہ بھی کر لیا تھا، وہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے اسے شایع کرانا چاہتے تھے، لیکن نامعلوم وجوہ کی

بنا پر ان کا مرتب کردہ متن بھی اشاعت پذیر نہ ہو سکا، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی بھی ایک زمانے میں اس کی ترتیب و اشاعت کی فکر میں تھے۔

جمہرۃ انساب العرب لابن حزم کی اشاعت کسی ہندوستانی اسکالر: مولانا سورتی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، مزمل حسین، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، مسعود حسن کسی کی قسمت میں نہ تھی، فرانس کے مشہور مستشرق لیفی پروونسال (پیرس یونیورسٹی) نے اسے مرتب کیا اور دار المعارف قاہرہ نے ۱۹۴۸ء میں اس دُرِّ بے بہا کو شایع کر کے اس سے استفادہ عام کر دیا۔ اب اس کا بہت اعلیٰ علمی اڈیشن مرتبہ الاستاذ عبد السلام محمد ہارون قاہرہ سے ۱۹۶۸ء میں شایع ہو گیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے میں ابو بکر محمد بن احمد الصنوبری الضبی (متوفی ۳۳۴ھ) کے دیوان کا ایک نسخہ محفوظ ہے (رقم ۲۰۲) جو اپنی ندرت کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مجھے لکھا کہ دیوان الصنوبری کے مخطوطے کے بہت سارے حصے وہ دیکھ چکے ہیں، اب نقل کرنا باقی ہے۔ حالات زندگی کے سلسلے میں بہت سی معلومات انھوں نے جمع کر لی تھیں اور راغب الطباخ نے اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء اور الروضیات (حلب ۱۹۳۲ء) میں جو اشعار الصنوبری کے درج کیے ہیں، ... ان کا مقابلہ وہ دیوان کے مخطوطے سے کر رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ اس نسخے کی فلم دمشق کے کسی عالم نے منگوائی ہے اور وہاں بھیجنا منظور کر لیا گیا ہے اس خبر نے انہیں بالکل مایوس و افسردہ کر دیا۔

اسی زمانے میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی (استاد تفسیر کلکتہ مدرسہ) عربی زبان و ادب کے معروف عالم و محقق جن کے تحقیقی مضامین عربی رسالوں میں شایع

ہوتے رہتے ہیں' دیوان الصنوبری مرتب کرنے پر آمادہ تھے، اس سلسلے میں ان سے میری خط وکتابت بھی رہی، میں سمجھتا تھا کہ معصومی صاحب کم وقت میں بہتر کام کر سکیں گے لیکن اس اطلاع پر کہ ایک شامی عالم اسے شایع کرنے والے ہیں، انھوں نے اپنا کام روک دیا۔ شاید اس لیے بھی کہ نشر و اشاعت کی جو آسانیاں عرب فضلا کو حاصل ہیں وہ ہمیں میسر نہیں۔ میرے خیال میں جن اصحاب نے اب تک اس مخطوطے کی ترتیب میں دلچسپی لی، مولانائے معصومی اس دیوان کی ترتیب کے لیے ان سبھوں میں سب سے زیادہ موزوں تھے اور ان کا مرتب کردہ دیوان شام سے شایع شدہ اڈیشن سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتا، دمشق سے اگر کوئی اڈیشن نکلا تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن ایشیاٹک سوسائٹی کے اسی نسخے پر مبنی اڈیشن ڈاکٹر احسان عباس استاد ادب عربی بیروت یونیورسٹی نے جواب مبحث العلمی جامعہ اردن (عمان) کے ڈائرکٹر ہیں دیوان الصنوبری مع اضافات واستدراکات بیروت سے ۱۹۷۰ء میں شایع کر دیا ہے، یہ بہت اچھا علمی وتنقیدی اڈیشن ہے۔

مسعود حسن کوئی تیس ۳۰ سال تک پٹنہ کالج، محسن کالج ہوگلی، سنٹرل کالج (موجودہ آزاد کالج)، کلکتہ مدرسہ اور کلکتہ یونیورسٹی میں عربی وفارسی اور اسلامیات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس عرصہ میں ہزاروں طالب علم ان سے فیضیاب ہوئے ہوں گے اور ان میں سے کتنے حکومت کے اچھے عہدوں پر سرفراز ہوں گے اور کتنے ایسے ہونگے جو کالجوں، اسکولوں اور مدرسوں میں استاد کے فرائض انجام دے رہے ہونگے، اور نئی نسل کو اپنے علمی فیوض سے سیراب کر رہے ہوں گے۔

ان کا تعلق کلکتہ کے مختلف اداروں سے رہا۔ وہ ایران سوسائٹی کے لائف ممبر

تھے، عرصے تک اس کی کونسل کے رکن اور مجلہ انڈو ایرانیکا کے مقامی اڈیٹروں میں رہے' وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن تھے اور دس سال تک اس کے جوائنٹ فیلولجیکل سکریٹری رہے۔ وہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کے ادارۂ ترجمہ وتالیف (کلکتہ) کے بڑے سرگرم کارکن تھے جہاں سے متعدد مفید کتابیں شایع ہوئیں۔

مسعود حسن خلیق اور متواضع تھے۔ وہ کم آمیز اور کم سخن تھے۔ خاموش طبیعت رکھتے تھے اور نرم لب و لہجے کے آدمی تھے۔ میں نے کبھی انہیں اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا۔ نامناسب بات سن کر بھی وہ عام طور پر خاموش رہتے۔ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ضروری ہوا تو وہ نہایت شایستہ لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتے، نہ اپنی بات پر زیادہ اصرار کرتے اور نہ اسے منوانے کے لیے زیادہ جوش وخروش کا اظہار کرتے۔ یہ ان کی زندگی کا عام رویہ تھا۔ خاص مواقع اور خاص مسائل پر ان کا انداز ضرور مختلف ہوتا تھا جو ایک فطری بات تھی۔ وہ عام طور پر جھگڑوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے اور اختلاف سے بچتے تھے، لیکن ان کی رایوں میں استحکام و صلابت ہوتی تھی اور جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تھے تو وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے، زندگی میں انھوں نے غلط فیصلے بھی کیے اور اسکی پاداش بھی انہیں بھگتنی پڑی۔ میرے ناقص خیال میں کلکتہ مدرسہ میں پرنسپل ہوکر جانے کا انکا فیصلہ کچھ صائب نہ تھا۔ وہاں کے اساتذہ سے (جن میں کچھ اہم اور لائق علما بھی تھے) اگر وہ اپنے تعلقات استوار رکھتے اور اپنے لطف وکرم، اپنی نرم گفتاری وخوش اخلاقی سے ان کے دل جیتنے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ اس ذہنی کشمکش اور ابتلا میں نہ پڑتے جس میں ان کی زندگی کے کئی قیمتی سال ضایع ہوگئے' ان کے

اس زمانے کے خطوط سے جو انھوں نے مجھے لکھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی ذہنی تکلیف اور کیسے کرب میں مبتلا ہیں۔ اس نامناسب فضا نے ان کی کارکردگی کو خاصا متاثر کیا اور ان کا ذہنی سکون درہم برہم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو علمی منصوبے ان کے ذہن میں تھے انہیں بروے کار نہ لا سکے۔

مسعود حسن تنہائی پسند تو نہ تھے ہاں کم آمیز تھے۔ وہ زیادہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے کے حق میں نہ تھے لیکن جن سے ان کے تعلقات ایک بار قائم ہو گئے ہمیشہ قائم رہے۔ وہ دوستوں سے دوستی نبھانے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ کلکتہ کے دوستوں میں جسٹس خواجہ محمد یوسف، پروفیسر جگدیش نرائن سرکار، پروفیسر عطا کریم برق، پروفیسر شاہ مقبول احمد، ڈاکٹر محمد صابر خاں، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد (متوفی ۲۲ دسمبر ۱۹۸۵ء) سے ان کے دیرینہ مراسم تھے کچھ اور احباب بھی ہوں گے۔ ان کے مدرسہ شمس الہدیٰ کے دوستوں میں پروفیسر حکیم عبدالاحد اور راقم الحروف کے تعلقات کا زمانہ پچاس سال کو محیط ہے، اس عرصے میں کتنے انقلابات آئے، حالات زیر و زبر ہوئے لیکن ان کی محبت اور ان کا خلوص ہمیشہ خوشبو بکھیرتا رہا۔

مرحوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رکھتے تھے چنانچہ انہیں بہت اچھی تعلیم دی اور ان کی بہت اچھی تربیت کی۔ خان بہادر مولانا ابونعیم محمد مبارک کریم سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز حکومت بہار کے صاحبزادے مولانا محمد تبارک کریم فاضل شمسی (مقیم حیدرآباد) کی بیٹی ان کے عقد میں تھیں، یہ پانچ تعلیم یافتہ اور ہونہار بیٹے اپنی نشانی چھوڑ کر ۱۵ اپریل ۱۹۷۸ء کو

رحلت کر گئیں۔ بڑے بیٹے سعید حسن تعلیم کی تکمیل کے بعد مرکزی حکومت میں ریلوے بورڈ میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ رشید حسن میکانیکل انجینیر ہیں اور کلکتہ کی ایک اہم فرم میں ملازم ہیں۔ وحید حسن ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں اور کلکتہ ہی میں پریکٹس کرتے ہیں، حمید حسن نے اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے اور فرید حسین بی کام کر رہے ہیں۔ مرحوم کی دوسری شادی اپنے قریبی عزیزوں میں ہوئی، ان کے بیٹے لبید حسن اور ولید حسن چھوٹے ہیں اور اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں، خدا ان سبھوں کو خوش و خرم رکھے اور دینی و دنیوی سعادتوں سے مالا مال کرے۔

مسعود حسن مرحوم نے متعدد علما کی رحلت پر رسالہ معارف میں "وفیات" کے تحت پرمعلومات تحریریں شائع کرائی ہیں آج اسی عنوان "وفیات" کے تحت مرحوم پر یہ صفحات شائع ہو رہے ہیں۔

الحاج مولوی عین الحق اعظمی

افسوس ہے کہ ۹ اگست کو الحاج مولوی عین الحق اعظمی کانپور میں رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ۵ فروری ۱۹۱۱ء کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں کاٹھ تراؤں میں جو اب ضلع مئو میں ہے پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، مولوی کرنے کے بعد انٹرنس پاس کیا اور ۳۲ء سے اعظم گڑھ میں چمڑے کی تجارت شروع کی جس میں اللہ نے برکت دی مگر انکی حوصلہ مند طبیعت اس پر قانع نہیں ہوئی اور ۵۹ء سے کانپور بھی انکی جولانیوں کا مرکز ہو گیا، یہاں جاجمؤ میں انھوں نے نیولائٹ ٹینری کی داغ بیل ڈالی اور جب کاروبار میں زیادہ وسعت و ترقی ہوئی تو ۶۷ء میں یہیں توطن اختیار کر لیا، اب یہ کاروبار اتنا بڑھ گیا ہے کہ انکے پانچ بیٹے شب و روز اسی میں لگے رہتے ہیں۔

علم و تعلیم سے انکو بڑا شغف تھا، اکثر دینی مدارس کی مالی امداد کرتے تھے خود مدرسۃ الاسلام کے نام سے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کیا جسکے سالانہ جلسوں میں مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے مشاہیر شریک ہوتے تھے، جاجمؤ میں انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کیلئے جامعۃ الزہرا قائم کیا۔

دار المصنفین کے علاوہ اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کی یادگاریں مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور شبلی کالج بھی،

تینوں اداروں اور انکے ذمہ داروں سے حاجی صاحب مرحوم کے روابط تھے، دارالمصنفین میں انکی آمد و رفت ۱۹۳۳ء
سے شروع ہوگئی تھی، انھوں نے اسکی فصل بہار دیکھی تھی، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی مجلسِ
علم وادب میں بھی وہ باریاب رہ چکے ہیں، کانپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی جب وہ اعظم گڈھ آتے
تو یہیں قیام کرتے مجھ پر انکا خاص التفات و کرم رہتا، جب طبیعت ٹھیک رہتی تو ہر ہفتہ انکا خط آتا، میں بھی کانپور جاتا
تو ان سے ضرور ملتا، اس سال رمضان سے پہلے وہ عمرہ کیلئے جا رہے تھے تو مجھے تار دیکر بلوایا، کیا خبر تھی کہ
یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

دارالمصنفین میں باہر سے جو مہمان آتے یا اسکی مجلس انتظامیہ کے معزز ارکان تشریف لاتے تو شہر کے دوسرے
عائد کی طرح وہ بھی ان اکابر سے ملنے دارالمصنفین آتے اور اپنے یہاں چائے یا ناشتے پر مہمانوں کو مدعو کرتے،
وہ بھی دارالمصنفین کی دعوتوں میں مدعو ہوتے تھے۔

مولانا مسعود علی ندوی مرحوم اور حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند
کے سرگرم رکن تھے، دونوں سے خاص تعلق کی بنا پر حاجی صاحب بھی ان تحریکوں میں عملی حصہ لیتے، یہ
اعظم گڈھ کی جمعیۃ کے سکریٹری بھی رہے۔

حاجی صاحب صوم و صلوٰۃ کے بچپن سے عادی تھے، صبح سویرے اٹھ جانے کا معمول تھا فجر سے
پہلے تہجد پڑھتے اور تلاوت کرتے اور فجر بعد اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، متعدد بار حج و زیارت سے
مشرف ہوئے، زکوٰۃ تو نکالتے ہی تھے اسکے علاوہ بھی غریبوں اور ضرورتمندوں پر بہت کچھ خرچ کرتے
رہتے تھے، علماء و صلحاء سے برابر تعلق رکھا، حضرت مولانا علی میاں سے خاص تعلق تھا انکی خدمت میں
اکثر جایا کرتے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا۔

برسوں سے صحت اچھی نہیں تھی اور موتوا قبل ان تموتوا کی تفسیر بن گئے تھے، اللہ
تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین!!

"ض"

مطبوعاتِ جدیدہ

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت از جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات
۳۶۸، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: مکتبہ رحمت عالم، ۱۸۳۸ لال کنواں، دہلی۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی کو قرآنی علوم سے بڑا شغف ہے، عرصہ سے وہ
دہلی میں درس قرآن کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ
کے ترجمہ و تفسیر پر ان کی کتاب محاسن موضح القرآن کو اہل نظر سے داد و تحسین
حاصل ہو چکی ہے، اب زیر نظر کتاب میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی
تفسیر ترجمان القرآن کو موضوع بحث بنا کر اس پر بعض اعتراضات و شبہات کا
جواب دیا ہے، یہ اصلاً ان کا وہ مقالہ ہے جو مولانا آزاد صد سالہ تقریبات کے
موقع پر ایک سمینار میں پیش کیا تھا اور اب اسے مزید ترمیم و اضافہ کے بعد
کتابی صورت میں شایع کیا ہے، اس میں وحی، توحید، نبوت و رسالت، وحدت
دین اور جہاد جیسے اہم مباحث میں مولانا آزاد کی بعض تحریروں سے جو شبہات
پیدا ہوئے تھے ان کا ازالہ خود مولانا ہی کی دوسری تحریروں سے بڑی خوبی سے
کیا گیا ہے، مولانا نے حضرت یوسفؑ اور ذوالقرنین کے واقعات پر بڑی شرح
و بسط کے ساتھ بحث کی ہے، لیکن دوسرے قصص اور احکامی آیات کی تفسیر
و وضاحت میں اختصار سے کام لیا ہے، فاضل مولف نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

"صاحب ترجمان القرآن نے واقعات و قصص کے صرف سبق آموز معارف کو نمایاں کیا ہے اور فقہی مسائل کو آیات قرآنی کی اجمالی تشریح و تفہیم تک محدود رکھا ہے" ان خوبیوں کے باوجود فاضل مولف کے بعض خیالات مبہم بھی ہیں اور محل نظر بھی، مثلاً "الائمۃ من قریش" کے سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "یہ فقرہ اگر جملہ خبریہ ہے تب بھی یہ خبر درست نکلی اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت قریش کے مختلف خاندانوں کے ہاتھ ہی میں رہی، بنی عباس کے زوال کے بعد عثمانی ترکوں نے عرب کا سیاسی اقتدار سنبھالا" اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ عثمانی ترک، قریش ہی کے کسی خاندان کی نسل سے ہیں، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "آل نبیؐ کے لیے زکوٰۃ اس لیے حرام کر دی گئی کہ وہ دولت مندوں کے مال کا میل کچیل ہے" کیا بنی ہاشم کے لیے زکوٰۃ کی حرمت کی وجہ صرف یہی ہے؟

اسلام کے قانون مساوات کے ضمن میں یہ کہنا کہ "اسلام میں فطری اور قومی مصالح کا اس حد تک لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اصول متاثر نہ ہوں" یہ اہم دعویٰ مزید قوی دلائل کا محتاج و متقاضی ہے، ژولیدہ بیانی سے بھی یہ کتاب خالی نہیں ہے مثلاً "مولانا معین الدین شاہ ندوی ایڈیٹر معارف مرحوم نے معارف اعظم گڈھ کے نظرات میں لکھا تھا" ص۱۴۲ معارف کے شذرات کو ایک اور جگہ نظرات لکھا ہے، ایک اور مثال ملاحظہ ہو: "مولانا نے اس آیت کے ترجمہ میں اکثر مفسرین کو دیکھا اکثر مترجمین فارسی اور اردو کو نہیں دیکھا، ص۱۵۱

چند ایران شناس از جناب کبیر احمد جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۸۰ روپئے

پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ایرانی تہذیب و تمدن اور فارسی زبان و ادب کی دلکشی و رعنائی دوسری قوموں اور تہذیبوں کے لیے بھی ہمیشہ جاذب نظر اور پرکشش رہی ہے۔ چنانچہ فارسی شعر و ادب کو متعارف کرانے اور اس کی قدر و قیمت کو نمایاں کرنے میں غیر ایرانی محققین و فضلا کی کد و کاوش، ایرانی اہل قلم کی مساعی سے کم نہیں، زیر نظر کتاب میں فاضل مولف نے دور حاضر میں فارسی تہذیب و ادب کے چار شیدائیوں ترکی ادیب احمد آتش، اطالوی فاضل الیساندرو بوزانی، اسرائیلی اہل قلم میخائیل زند اور چیکوسلواکیہ کے محقق یرژی بیچکا کے سوانح اور انکی علمی خدمات کا جائزہ عمدہ انداز میں لیا ہے، لائق مرتب کے پُر از معلومات حواشی نے کتاب کا فائدہ دوچند کر دیا ہے، کتابت کی غلطیوں سے کتاب پاک ہے اور یہ بڑی خوبی ہے۔

اقلیتوں کے تعلیمی حقوق اور مسائل از جناب پروفیسر اکبر رحمانی، متوسط تقطیع، اچھا کاغذ، بہتر کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۷۶، قیمت ۴۰ روپئے پتہ: ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ، جلگاؤں، مہاراشٹر ۴۲۵۰۰۱۔

پروفیسر اکبر رحمانی ایک اچھے اور تجربہ کار معلم ہیں، درس و تدریس کے مسائل اور فن تعلیم انکا پسندیدہ موضوع ہے اپنے مفید رسالہ آموزگار میں وہ تعلیم بالغاں، ادب اطفال، اقلیتوں کے تعلیمی حقوق اور مسلمانوں کی تعلیم کی راہ میں درپیش قانونی و سماجی مشکلات و مسائل پر بڑی دلسوزی اور ہوشمندی سے اظہار خیال کرتے رہتے ہیں، زیر نظر کتاب میں ان بکھرے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے اس میں اقلیتوں کے تعلیمی حقوق، مہاراشٹر کے تعلیمی مسائل، نئی تعلیمی پالیسی، اردو تعلیم اور فکر و نظر کے زیر عنوان اہم اور مفید چیزیں پیش کی گئی ہیں، ہندوستان کے دستور و آئین کی روشنی میں اقلیتوں کے تعلیمی حقوق، انکے تحفظ اور نئی تعلیمی پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بعض دشواریوں کا مفصل اور جامع جائزہ لیا گیا ہے، ہندوستان میں اردو تعلیم پر انکی بعض رائیں تجربہ کی کسوٹی سے

ابھر کر سامنے آئی ہیں مثلاً "اگر ہم اردو زبان وادب کا تحفظ چاہتے ہیں اور اسے ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں تو اردو ثانوی مدارس میں فارسی یا عربی کی تعلیم کو لازمی کرنا ہوگا" مصنف کی دینی و ملی حمیت و غیرت کتاب کا نمایاں وصف ہے، اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں اور دینی مکاتب و مدارس اور تعلیمی تبلیغی اداروں کے ذمہ دار حضرات کے لیے کتاب میں معلومات کے علاوہ معرفت و بصیرت بھی ہے۔

تجلیات آسی از جناب ڈاکٹر دینا ناتھ چترویدی زاہد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور بہتر کتابت وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۰، قیمت ۳۰ روپیے، پتہ: انجمن فروغ ادب، بشنی پور، بلیا، یوپی۔

حضرت آسی سکندرپوری ثم غازیپوری جلیل القدر عالم اور صاحب سجادہ بزرگ تھے، لیکن انکی شہرت کا ایک بڑا سبب انکا کلام بھی ہے جو تصوف کے اسرار و رموز پر مشتمل ہونے کے علاوہ زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی مزین ہے، انکی شخصیت اور شاعری پر پہلے بہت کچھ لکھا گیا ہے، اب لائق مولف نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد انکے سوانح، اردو اور ہندی شاعری سے انکے تعلق اور صوفیانہ شاعری پر عمدہ مواد جمع کر دیا ہے، اسکے علاوہ انکے چند خطوط بھی انھوں نے حاصل کر لیے ہیں اور اس سے بھی بڑھکر دیوان آسی کے ایک قلمی نسخہ کی یافت میں انکو کامیابی حاصل ہوئی، چنانچہ زیر نظر کتاب میں حضرت آسی کے مطبوعہ کلام کے انتخاب کے علاوہ انکے غیر مطبوعہ کلام کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جس سے اسکی اہمیت و وقعت میں اضافہ ہوا ہے، ڈاکٹر چترویدی ہندی کے استاد ہیں لیکن حضرات صوفیہ سے انکو بڑی عقیدت اور اردو ادب سے بھی خاص تعلق ہے، کتاب کی ترتیب میں خوش سلیقگی سطر سطر سے نمایاں ہے، البتہ سہو کتابت سے فصوص الحکم کو قصص الحکم، سفینۃ الاولیاء کو سفینات اولیا اور کتاب الطواسین کو الفواسین لکھدیا گیا ہے، ایک مصرعہ، کیا کھینچے تصویر تری بوالعجبی ہے بھی غلط لکھ گیا ہے، یہ بوالعجبی ہے۔

(ع - ص)